دُنیا ہماری

افسانے

پَردیسی

راج محل پبلشرز جمُوں کشمیر

بار اوّل　　تعداد ۱۵۰۰　　۲ روپے ۸ آنے

فہرست

رامانند ساگر کے نام

پیش لفظ

اِس مجموعے کی کہانیاں سادہ ہیں اور اپنی سادگی اور معصومیت کی بنا پر ہمیں ٹالسٹائی کی یاد دلاتی ہیں۔ اِن میں نہ صرف عنصری عواطف اور نفسِ انسانی کی بنیادی کیفیات کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ بلکہ تفسیر کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ یہ کہانیاں اُسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں جس جذبے کے تحت مقالہ "فن کیا ہے؟" میں ٹالسٹائی نے "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" کے مصنّف کو شیکسپیئر سے بڑا فن کار قرار دیا تھا۔ آج کا نقاد ٹالسٹائی کے اِس دعوےٰ کو قبول نہیں کرتا۔ لیکن وہ ٹالسٹائی کے نقطۂ نظر سے متاثر ہوئے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ ٹالسٹائی نے "جنگ اور امن" اور "اینا کرینینا" کی نظیر دُنیا آج تک پیش نہ کر سکی۔ اِس لئے نقاد خُوب جانتا ہے کہ ٹالسٹائی کا دعوےٰ کسی مجذوب کی بڑ نہیں۔ اِس کے الفاظ کے پیچھے ٹالسٹائی کا فنی تجربہ بول رہا ہے۔
اِن کہانیوں میں ہمیں کسی گہرے فلسفے، دُور از کار تخیل، اور اِن

دونوں چیزوں سے وابستہ صوفیانہ نکات کو دیکھنے کی دعوت نہیں دی گئی۔ جو کچھ کہا گیا ہے محسوس کر کے کہا گیا ہے اور برملا کہا گیا ہے۔ پردیسی کی کہانیوں میں موجودہ زمانے کی "انڈر کرنٹ" کا بکدستی نہیں۔ نہ ہی اِن میں کوشش کی گئی ہے کہ مقام اوج کو پہنچ کر آخری سطر میں لایا جائے تاکہ مصنّف دُور کسی ٹیکرے پر بیٹھ کر پڑھنے والے پر مسکرا سکے۔ خاص طور پر جس کے پڑھنے والا اختتام پر پہنچ کر حیرت زدہ رہ جائے اور پچھلے اوراق پلٹ کر دیکھے کہ آخر کس سطر پر اُس نے زیادہ توجہ کیوں نہیں کی اور نتیجے کے طور پر اختتام کو مصنّف سے پہلے نہیں پا سکا۔ کون سا سلسلہ ہے جسے کھو دینے پر اُسے آخرش اپنے آپ کو ذہنی اپاہج تسلیم کرنا پڑا ہے۔ اور در اصل اُسے "اِس قسم" کے مصنّف کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے تھا۔ پردیسی کی رفاقت میں ہمیں راستہ، اِس کے ایک طرف سنگِ میل، اور آخر میں منزل سامنے نظر آتی ہے۔ لیکن راہ میں جا بجا گل بوٹوں، وادیوں اور چشموں کا نظارہ کرتے ہوئے ہماری طبیعت نہیں اُکتاتی۔ پڑھنے والے کے اعصاب میں تناؤ اور بالآخر تسکین پیدا کرنا اب ایک پُرانا فن ہو چکا ہے اور موجودہ نقاد اِس کا قائل نہیں رہا۔ "سکھو کی واپسی" میں ہم دیکھتے ہیں کہ نریندر اپنی بیوی کی موت کا چار سال تک ماتم کرتا رہتا ہے۔ لیکن آخر ایک ایسی عورت سے شادی کر لیتا ہے۔ جس میں ایک اچھی بیوی بننے کی تمام صفات موجود تھیں۔ لیکن شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی کے مُنہ سے یہ فقرہ

سُن کر کر اُسے ایسا خاوند پسند نہیں جس کی پہلی اولاد موجود ہو۔ وہ پہلی بیوی کی اولاد شیاما کو سکھو کے ساتھ ایک گمنام گاؤں میں بھیج دیتا ہے۔ اور خود اپنی بچی کے فراق میں کڑھتا رہتا ہے۔ کرشنا، اُس کی دوسری بیوی بھی اپنی گود بھری دیکھنے کی خواہشمند ہے لیکن اُس کے ہاں بچہ پیدا ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور نہ وہ جانتی ہے کہ اُس کی ایک سوتیلی بچی زندہ ہے۔ ایک دن نریندر کی غیر حاضری میں سکھو شیاما کی موت کی اطلاع دینے آتا ہے اور کرشنا کو اس اطلاع سے حیرت میں ڈال کر چلا جاتا ہے۔ شیلا کی موت ایک قدرتی موت ہوتی ہے اور اصطلاحاً اس میں کوئی المیہ عنصر نہیں لیکن پردیسی بنیادی طور پر "مصورِ غم" ہے۔ ایک قسم کے خاموش غم کا مصور جو موت کے المناک واقعے سے زیادہ المیہ ہوتا ہے۔ اور نریندر کی ساری زندگی کو ایک بیچارگی سے پٹا ہوا، دردناک جیون بنا دیتا ہے۔ اور سب سے زیادہ خوبی کی بات یہ ہے کہ مصنف اس واقعے کے لئے کسی کو مطعون نہیں کرتا۔ نریندر کا عزم شادی بجائے خود کوئی گناہ نہیں اور نہ کرشنا کی رنڈوے کی اولاد سے نفرت میں کرشنا کا کوئی قصور ہے۔ چنانچہ اس ادبی تانے بانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی میں ہمارے مقصد کے باوجود یا اس کے بغیر ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ جن پر انسان کو کوئی قدرت نہیں اور اس کے لئے کسی بشر کو مطعون کرنا ایک سفلہ سی بات ہو جاتی ہے۔

بخشش و خیر کا جذبہ مصنف کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ اُس کے کرداروں میں بدرجۂ اتم نمایاں ہے۔ "میرا حق" میں عبدل اپنے مالک شنکر داس کے ٹھاٹھ

کے لئے اپنی زندگی تک وقف کر ڈالتا ہے۔ لیکن جب شنکر داس کا بیٹا گوپی ناتھ کاروبار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھالتا ہے۔ وہ ایک معمولی واقعہ کی بنا پر عبدل کو نہ صرف ایک چپت لگا کر ذلیل کرتا ہے بلکہ اُسے ملازمت سے علیحدہ بھی کر دیتا ہے۔ عبدل نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے پریس کی مشین کے گرد کی دلدل صاف کی تھی۔ اور وہاں گلاب کے پودے اُگائے تھے۔ اگر اُس نے اِس کی نگہداشت میں گوپی ناتھ کے نیچے کی معمولی سی گوشمالی کی تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ عبدل اُس مشین اور اُس کے نواح کا ایک حصہ ہو چکا تھا۔ شاید کوئی قانون مشین پر عبدل کے حق کو تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن مشین صحیح طور پر عبدل کی تھی ——— بعینہٖ جیسے (EMERSON) کے قول کے مطابق "یہ چراگاہ لاک کی ہے اور وہ منیم کی، لیکن یہ دراصل اُس کی ہے جو دیکھنے والی آنکھ رکھتا ہے" ——— یعنی شاعر کی۔ عبدل کی فریاد اگر کسی عدالت میں نہیں سُنی گئی تو نہ سہی۔ یہ انسان کے بنیادی جذبہ خیر کے نام اپیل تو ضرور ہے۔ اور کشادہ دلی، بخشش وسخاوت کے جذبے کی دلیل ہے۔ کہانی میں آگے چل کر یہ چیز اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب مشین کے کل پرزے، شاید عبدل کے ہاتھوں سے آشنا، اُسکی محبت بھری اُنگلیوں کا لمس حاصل کئے ہوئے چلنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تو عبدل اپنی ذلت کا خیال بالائے طاق رکھ کر پھر اسی مشین کو درست کرنے کے لئے آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اِس مشین سے کبھی جدا نہ ہوا۔ وہ برخاست کر دئے جانے کے باوجود دن میں ایک آدھ بار مشین کو دیکھنے

کے لئے اُس طرف ضرور آ نکلنا ــــــــ

"وہ اب بھی اندھیرا چھا جانے کے بعد کارخانے میں چلا جاتا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر جب اُسے اطمینان ہوتا کہ وہاں کوئی چوکیدار نہیں تو برآمدے میں جاتا۔ بند دروازوں کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا پھر باغیچے میں آتا۔ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے میوہ دار درختوں کو دیکھتا ــــــ اُسے محسوس ہوتا جیسے ان میں اب وُہ رونق نہیں جو بڑے پنڈت کے دِنوں میں ہوتی تھی۔ ہر چیز میں اُسے اُداسی سی، بے دِلی سی، اور افسردگی سی دکھائی دیتی ......"

(میرا حق)

اگرچہ پردیسی کی کہانیوں میں بہت تنوع ہے۔ تاہم بیشتر کہانیاں زندگی کی تصویر کے تاریک رُخ سے تعلق ہیں۔ آپ جنسیات کی دلدل میں زیادہ نہیں پھنستے۔ اُنہوں نے اسے اپنے دوسرے ہمعصروں پر چھوڑ رکھا ہے۔ اگرچہ کہانی "سہارا" اِس بات کا ثبوت ہے کہ جب ضرورت ہو۔ تو آپ جنسی مسائل کا بھی ایسا ہی گہرا مطالعہ کر سکتے ہیں ــــ اِس کہانی میں ایک معمر عورت پھر جنسی طور پہ بیدار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بہت سے بوڑھے مردوں اور بوڑھی عورتوں پر ایک ایسا دَور CLIMACTERIC آتا ہے۔ جب وُہ از سرِ نو جوان ہو جاتے

ہیں۔ وہ عورت "گناہ" کا ارتکاب کرنا چاہتی ہے۔ اُسے اپنی تذلیل کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن بالآخر مرگِ انبوہ میں شامل ہو جاتی ہے۔

خدا ہمارے سر پر موجود ہے۔ اِس کے باوجود اُس کی دُنیا اور اُس کے بندے دُکھی ہیں۔ اِنسان جنّت کھو چکا ہے اور شاید اُسے دوبارہ نہیں پا سکے گا۔ وہ اپنی جوت کے نیچے کراہ رہا ہے۔ اُس کے نزدیک سانس لینا ہی زندگی رہ گئی ہے۔ بچپن ہی سے اُسے تن آسانی، رضاجوئی اور شکست پسندی سکھائی گئی ہے۔ حالات کو بہتر بنانے اور اِنقلاب پیدا کرنے کی جدوجہد سرے ہی سے مفقود ہے۔ کیونکہ جو تقدیر میں لکھا ہوا ہو وُہ پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ سب سے بڑی چیز جو مُصنف کو اذیّت دیتی ہے۔ وُہ عوام کا اپنے بُرے ماحول کے خلاف احتجاج نہ کرنا ہے۔ بلکہ اِن کسانوں اور مزدوروں کی سادگی ان احمقانہ حدود تک پہنچی ہوئی ہے کہ یہ مکّار سے مکّار اِنسان کی باتوں پر بھی ایمان لے آتے ہیں۔ "اگلے سال" میں اِبراہیم خُون چوسنے والے حاجی بدرالدّین کو کسی پیغمبر سے کم نہیں سمجھتا۔ "کاریگر" میں ماہم دین کو اِس بات کا احساس ہی نہیں کہ اُس کی ہڈیاں تک نچوڑ لی گئی ہیں لیکن "اگلے سال" میں اِبراہیم کو آخر میں حقائق کا عِلم ہوتا ہے۔ اور اُسے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ زیادہ منافع حاصل کرنے کے لئے اُسے دلال کو درمیان سے نکال دینا ہوگا۔ وُہ چھوٹے سے پیمانے پر اِس تجربے کا آغاز کرتا ہے اور کارندے کے سامنے "وڈ" پر چیز

دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ جب وُہ اپنا مال براہ راست فروخت کرتا ہے تو اس کا کیا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس بات کی تشریح کی ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ سرمایہ داری کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے ہی سے ابراہیم کی بیداری کا ثبوت مل جاتا ہے۔

لیکن ہر فرد ابراہیم کی سی سادہ مگر دقیق نظر نہیں رکھتا۔ "عام دین" کی مثال لیجئے۔ وُہ بنا جانے بوجھے اِس لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اُس کا شاہکار ایک ایسے اژدہے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جس کی "چوبیں آنکھوں میں نفرت، کشمکش اور انتقام کی بے پناہ آگ دھک رہی ہے۔ اور جیسے وُہ سارے کرۂ ارض کو ڈسنے، اپنے زہر سے تباہ و خاکستر کر لے کے لئے بھاگا آ رہا ہے ——" اور یہ اژدہا "نفسیات کے مُعلّم" کی آنکھوں کے لئے ایک آنے والے انقلاب کی علامت بن جاتا ہے۔ مُصنف یہاں ایک خامکار کی طرح اِس لوٹ کھسوٹ کے لئے ذمہ دار افراد یا فرقوں کو کچھ نہیں کہتا۔ وہ اُنہیں بھی ایک ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وُہ بھی ایک بڑی مشین کے کل پُرزے ہیں —— مہاجنی نظام کے محض کارندے! اُن کے باپ دادا نے جو کچھ اُنہیں ورثہ میں دیا ہے۔ وُہ اُس کی غور و پرداخت کر رہے ہیں۔ زندگی کے امتحان میں جہاں مقابلہ اِس قدر کڑا ہے اُنہیں بھی ایک سستی مارکیٹ کی تلاش ہے۔ ورنہ وہ خود ختم ہو جائیں گے۔ مُصنف W.B. YEATS کے ساتھ ہمنوا ہو کر کہتا ہے ——

The world is more full of weeping
than you can understand

(The stolen child)

کبھی کبھی کوئی ابراہیم اپنے افلاس سے مجبور، حقیقت کو پا بھی لیتا ہے۔
لیکن مصنف اچھی طرح سے جانتا ہے کہ اشتراکیت، خواہ اس کا پرچار
مزدور طبقہ میں کیا جائے مزدوروں پر بہت دیر تک اپنا تسلط نہیں
رکھ سکتی تا وقتیکہ ملک میں ذہنی انقلاب پیدا نہ کیا جائے۔ "لہروں کا رقص"
میں ہم دیکھتے ہیں کہ مزدور لوگ اپنی قسمت پر قانع اور شاکر ہیں۔ صرف
رؤف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ اور واقعی محسوس کرتا ہے کہ اس کی
موجودہ زندگی سے بُری زندگی ممکن ہی نہیں۔ وہ بہت دیر اس امید
پر زندہ رہتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب کوئی نہ بڑا ہوگا نہ چھوٹا
نہ امیر نہ غریب۔ لوگ حسب توفیق کام کریں گے اور پیٹ کی ضرورت
کے مطابق کھائیں گے۔ لیکن اُسے فوراً پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک
جنت الحمقا میں بس رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کوئی باہر سے
حملہ آور ہوگا اور دولت مند لوگوں کی انگلیوں سے سونا چھین کر اُن
کی جیبوں میں ڈال دے گا۔ انسان پر خدا کی لعنت جوں کی توں رہیگی۔
اس لئے وہ صابر رہنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔
"چنائیں" میں ہمیں نظر آتا ہے کہ جب کوئی بلند روح اپنے
اردگرد انسانیت کو روتی پیٹتی دیکھ کر بھگوان —— اُن کے رکھشک

کے حضور میں فریاد کرتی ہے۔ تو وُہی اِنسانیت جس کی خاطر وُہ احتجاج کے کلمے مُنہ سے نکالتی ہے اُس کے خلاف ہو جاتی ہے۔ اور اُس کی آواز کو شور وشغب سے زیادہ نہیں سمجھتی۔ ایک بنجر زمین میں دُعا و فریاد کے بیج بونے جیہ مستی؟ بھگوان مزے سے ایک طرف بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اور اُس کے کانوں پر جُوں تک نہیں رینگتی۔

تو گویا ہمیں اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان نیک و بد دونوں حالات میں جئے جاتا ہے۔ زندگی کا کھیل ختم نہیں ہوتا۔ اگرچہ ایک دوسرے کے دُکھ درد کو محسوس نہ کرنا کسی حد تک حیرت انگیز ہے۔ لیکن یہ پردیسی کی عظمت کا ثبوت ہے کہ اس کے باوجود وُہ کسی بشر کی ذہنیت کو مجرمانہ نہیں ٹھہراتا۔ وُہ بڑی خاموشی سے واردات بیان کئے جاتا ہے۔ اُس کی آواز میں جوش ہے۔ لیکن وُہ بھی خاموش۔ اِس لئے کبھی اُس کی آواز بھیانک ہو جاتی ہے۔ اور کبھی دھیمی پڑ جاتی ہے۔ آخر شور مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ پردیسی کے ساتھ ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ـــ

This is here the world ends not with a bang, but with a whimper

"سایڈ لاین" کے ہیرو کو نیم شعوری طور پر اِس بات کا احساس ہے کہ "نئی تیج" کا ایڈیٹر اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود وُہ اپنی زندگی سے بیکار مناسب نہیں سمجھتا۔ نوکری سے برخاست

کر دئے جانے کے بعد وُہ پھر اُسی ایڈیٹر کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جس نے اُس کی چیزیں بلا معاوضہ استعمال کی تھیں۔ ایڈیٹر اُسے کورا جواب دے دیتا ہے۔ آخر اُس کی مدد کے خیال سے اُس نے کہانیاں نہیں شائع کی تھیں اور یہ کیا کم تھا کہ "نئی صبح" کی مدد سے مصنف لوگوں میں مقبول ہوا تھا۔ بہت سے احمق ایڈیٹروں کی طرح "نئی صبح" کے ایڈیٹر کا بھی خیال تھا کہ اُن کے وجود ہی سے مصنف کا وجود ہے۔ اگر وُہ نہ ہوتے۔ تو شاید وُہ مصنف دُنیا کے سامنے نہ آتا۔ اور اِس امر میں وُہ مصنف کے GENIUS کو کوئی جگہ نہیں دیتے جو کسی نہ کسی جگہ پنپ کر رہتا ہے۔ ایسے بیہودہ مربیوں کی اِس کہانی میں اچھی طرح نقاب کشائی کی گئی ہے۔ جو کہتے ہیں، "صاحب! کہانی کے پیسے مصنفوں کو نہیں مانگنے چاہئیں۔ پیسے کمانے کے لئے آپ کوئی نوکری تلاش کر لیجئے۔ شہرت کے لئے نوکری کے وقت کے علاوہ محنت کیا کیجئے ——"

غرضکہ غریب لوگ ہر جگہ پستے ہی نظر آتے ہیں۔ کشمیر کے مزدور اپنے وطن کو ایک "برفانی دوزخ" سمجھتے ہوئے میدانوں میں اُتر آتے ہیں۔ نئی دہلی اور اِس قسم کے مقامات میں پہنچ کر وُہ خوشی کے ایک سراب کے پیچھے دوڑتے ہیں (جنت اور جہنم) کہانی "لباس تلے" میں وشومبر نوکر کو ایک بوسیدہ، کہنیوں پر سے پھٹا ہوا کوٹ مل جاتا ہے اور اُسے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔ اِس کہانی میں ایک غریب آدمی کی ذہنی کیفیات کا نہایت عمدہ تجزیہ کیا گیا

ہے۔ تحفے میں ملا ہوا کوٹ اُس کی دُوسری پوشش کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ ہر کوئی اُس کے نیم ڈھلے اور گیلے پاجامے سے یہی اندازہ کر لیتا ہے کہ یہ کوٹ وشومبر کا اپنا نہیں۔ عاریتاً لیا ہوا ہے بلکہ چُرایا گیا ہے۔ آخر کہاں تک کوئی اِس کوٹ کا سفید ہاتھی پال سکتا ہے!

"اکّو" میں ایک آٹھ سالہ بچّی کو بھی اِس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ دُنیا کی کِسی نعمت کا تقاضا کرنا بد اخلاقی اور بد تہذیبی کی علامت ہے۔ اور اگر اُس کے سامنے "ناشتہ" — کتّے کو دُودھ دیا جاتا ہے۔ تو اِس میں کوئی حق تلفی والی بات نہیں۔

"اصُول کی دُنیا" اپنی سادہ سی وضاحت کے اعتبار سے ایک پُر معنی کہانی ہے۔ رادھا کِشن زندگی میں کم از کم ایک بار، اور وہ بھی اپنے مرتے ہوئے بچّے کی جان بچانے کے لئے، ضمیر فروشی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن قدرت اِس بچّے کو اپنی آغوش میں چھپا کر رادھا کِشن کی رُوح کو ہمیشہ کے لئے ملوّث ہو جانے سے بچا لیتی ہے۔ قدرت کی اِس "کرم فرمائی" میں ایک حیرت زا کینہ وری شامل ہے۔ پڑھنے والے کے دِل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش رادھا کِشن نے اپنے ایمان کو بیچ دیا ہوتا۔

پردیسی نے یہ کہانیاں بہت سوچ بچار کے عالم میں لکھی ہیں۔ لیکن اِن کہانیوں کی پُر سکون سطح کے نیچے ہم ایک ایسا دِل دیکھتے ہیں۔

جو انسانیت کے دُکھ سے تار تار ہے۔ اُس کی ہموار آواز کبھی کبھی تقدیر کی آواز کی طرح فیصلہ کُن نظر آتی ہے۔ پردیسی کسی مہدی کے آنے کی اور بالآخر انسان کی نجات کی اُمید نہیں دلاتا۔ موجودہ دور کے حساس نوجوان کی طبعی قنوطیت اِس کے دِل اور وجود کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وُہ دیکھتا ہے کہ لوگ اپنا ایمان کھو چکے ہیں۔ اور کوئی چیز اُنہیں اُبھارنے کے لئے نظر نہیں آتی۔ مذہب چند رسوم و روایات کا ایک مرقعِ بن کر رہ گیا ہے۔ اور کسی قسم کا معاشرتی ردّو بدل بے معنی ہے۔ دُنیا کے کسی عقیدے میں تسلی نہیں بغیر اِس کے کہ انسان اپنی مکمل شکست کو تسلیم کرے۔ وُہ سب کچھ دیکھتا ہے وُہ سب کے لئے غم کھاتا ہے۔ اور جب ہم اُس کے ساتھ آنسو بہا چکتے ہیں تو پھر ہمیں ایک عجیب طرح کے سکون (KATHARSIS) کا احساس ہوتا ہے اور ہم دُنیا کی تمام نزاع کو زندگی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور ہمدردی سے پُر ایک نیا انداز قائم کر لیتے ہیں۔ عالم کے غم کی شدت میں ہمیں اپنا غم ہلکا محسوس ہونے لگتا ہے۔ پردیسی کی کہانیوں کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہ کہانیاں ہمیں زندگی کے گوناگوں مصائب کو برداشت کرنا سکھاتی ہیں ؂

راجندر سنگھ بیدی

لاہور

دفتر کی پریشانیوں سے فارغ ہو کر میں اکثر شام کو توی کے پل
پر آنکلتا تھا۔ شہر سے دور ہونے کے سبب یہاں بہت کم شور
ہوتا تھا۔ اور پھیلی ہوئی تاریکی میں سب ایک جیسے دکھائی دیتے تھے
کبھی کبھی سیالکوٹ سے آنے والی لاری بھوں بھوں کرتی ہوئی پُل پر سے
عبور کرتی تھی یا دور شنٹنگ انجن کی کرخت سیٹی سے فضا کی خاموشی ٹوٹ
جاتی تھی۔ اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کا ہنگامہ تاریکی میں بھی خاموش
نہیں پڑتا۔ مہاجنی دور کا نظام پوری آب و تاب کے ساتھ رات اور
دن، صبح اور شام چل رہا ہے۔ اور شاید چلتا رہے گا۔

کبھی کبھی سنیما سے واپس آتے ہوئے فوجی سپاہی پہاڑی گیت
گاتے گاتے، چھڑیاں گھماتے گھماتے، سگریٹ پیتے پیتے یا ایک دوسرے
کو گالیاں دیتے دیتے پُل پر سے گزر جاتے۔ اُنہیں میرے وجود کا

احساس تک نہ ہوتا کہ کوئی اپنے وطن سے دو سو میل دُور آہنی
جنگلے سے اُلجھا ہُوا ریت اور پتھر کے بے پناہ میدان میں اپنے
مُلک کے غیر مرئی حسن کے نقوش تلاش کر رہا ہے۔ اور اِسی جد وجہد میں
اپنے فریب خوردہ تاثرات کو بہلا رہا ہے۔ وُہ گُذر جاتے اور چھائی ہوئی
تاریکی کا سناٹا پھیلے ہوئے دریا کا نشیب و فراز دُور دُور کی بے رونق سی
پہاڑیوں کا غیر شاعرانہ تسلسل میری نگاہوں کا مرکز بن جاتے ہیں

آہ! اِس نظام میں، میں کس قدر مجبور اور بے حقیقت تھا۔ ریت
کے ذرّوں سے زیادہ بے مایہ اور اُن میں دبے ہوئے گول گول پتھروں
سے زیادہ بے حقیقت! آخر پیٹ ہی تو تھا جس نے مجھے اپنی دلکش
وادی سے نکال کر بہت دُور پھینک دیا تھا۔ جہاں ہندسے تیار
کرنا، محصول وصول کرنا، تلاشیاں لینا اور کبھی کبھی اپنے ضمیر کا گلا
گھونٹ کر رشوت لینا بھی میرا معمول تھا۔ میرا جسم گٹھا ہُوا تھا، اعضا
میں کافی تنومندی تھی۔ لیکن رُوح ـــــ کم بخت رشوت کے پیسوں
سے دُودھ پی پی کر بھی چمک نہ اُٹھتی تھی۔

پُل کے قریب سڑک کے بائیں طرف جُوتے کی ہٹی تھی۔ اور
ایک نانبائی کی دُکان! دُکان کے آگے شکستہ بنچ ہمیشہ خالی پڑی رہتی تھی۔
نانبائی بہت رات گئے تک چُولھے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ شاید
اُسے خریداروں کا انتظار رہتا تھا۔ میلے اور کالے برتنوں کو کبھی
ایک طرف سے اُٹھا کر دُوسری طرف رکھ دیتا تھا۔ اور کبھی کھانسنے لگتا

بعد موٹا سا بلغمی تھوک سڑک کے عین وسط میں پھینک دیتا تھا۔

شکستہ بنچ کے نیچے سے کالا ضعیف کتا نانبائی کی کھانسی پہچان کر ہی سڑک کے وسط میں کود کر پہنچتا تھا۔ شاید اُسے معلوم تھا کہ کھانسنے کے بعد نانبائی ہمیشہ بلغمی تھوک پھینک دیتا ہے۔ نانبائی کتے کو اپنی تھوک چاٹتے اور سونگھتے دیکھ کر دل ہی دل میں مسرت سی محسوس کرتا تھا۔ لیکن کتے کے متعلق اُسکی آنکھوں میں ہمیشہ حقارت جھلکتی رہتی۔ "ذلیل جانور —— جو صرف تھوک چاٹنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے!" اُسے فخر تھا کہ اُس کی دکان کی کوئی چیز، ہڈی، جلی ہوئی روٹی، یا سی سالن رائیگاں نہ جاتی تھی۔ حتیٰ کہ بلغمی تھوک بھی۔ جس کے لئے قدرت نے بہترین اُمیدوار شکستہ بنچ کے نیچے منتظر رہنے کے لئے پیدا کیا تھا۔

چونے کی بھٹی آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑی ہوتی تھی۔ گول گول بے حقیقت پتھر دہکتی ہوئی آگ میں جلنے کے بعد چونے کی ڈلیاں بنے ہوتے تھے۔ اب وہ بے حقیقت نہ تھے۔ عالیشان عمارتوں اور شاہی محلات کے کارخانوں میں اُن کیلئے مخصوص جگہ تھی۔ وہ بے جان ملبے اور اونچی اونچی عمارتوں میں مضبوطی کیلئے استعمال ہونے والے تھے۔ اور بھٹی کا مسلمان مالک اپنی خوشنما داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مستقبل کے حسین خواب دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اُسے یہ بھی شام کو سر میں سڑک پر چہل قدمی کرتے یا دمہ کے مریض نانبائی کو چونے کے فوائد سمجھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کالا کتا بدستور

نیم دائرہ بنا کر بنچ کے نیچے لیٹا رہتا تھا جنگلے کے پاس میری آہٹ سُن کر وُہ دُم کو پیٹ سے دبائے میرے پاس پہنچ جاتا۔ اور پھر دُم ہلا ہلا کر مجھے یقین دلاتا کہ مَیں ذلیل نہیں۔ وفادار جانور ہوں۔ اُس کی نگاہوں میں اُس وقت عجیب چمک پیدا ہو جاتی۔ جو تاریکی میں مجھے نمایاں طور پر دکھائی دیتی۔ جتنی دیر وُہ میرے لمس سے محظوظ رہتا اُس کی بشاشت میں کوئی فرق نہ آتا۔ اور نہ آنکھوں کی چمک میں کمی ہوتی۔ شاید وُہ محسوس کرتا تھا کہ ہم دونوں اِس نظام میں ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں۔ بظاہر مطمئن اور شاد لیکن اندر سے کھوکھلے ہوئے۔ پھیلے ہوئے وہ نانبائی سے کلغی کھوک چاٹنے کے لئے شکستہ بنچ کے نیچے اور میں شرفا اور غربا دونوں کی رشوتوں کی تھوکیں کھانے کیلئے! جو وُہ محصول خانے کے پاس سڑک کے وسط میں پھینک کر چلے جاتے تھے۔

مجھے کتّے سے پیار تھا ــــــ یہ ذات وفادار ہے اور اِس کی طبیعت حساس اِ بھی تک کے مالک کہ۔ یکھ کہ اِس کی بشاشت ظاہر نہیں ہوتی حالانکہ وہ بے حقیقت پتھروں کو کُندن بنا کر سیم وزر میں کھیلتا رہتا ہے۔ لیکن مجھے جو اِسی نظام میں مجبور اور بے حقیقت ہے۔ جو جلا نہیں، چُونا نہیں بنا۔ دیکھ کہ وُہ مچل اُٹھتا ہے بے وقوف کتّا! لیکن میری شام کی جد و جہد کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ مجھے اپنا مونس ملا تھا۔ یہ میری طرح ابھی چُونا نہیں بنا تھا ــــ

ریت اور پتھر کا بے پناہ میدان جس کے ایک طرف اُداس نوی

لیٹی ہوئی سی تھی۔ میرے سامنے تھا۔ اور دُور دُور کی بے رونق سی پہاڑیوں کا غیر شاعرانہ تسلسل ـــــ !"

آپ یہ نہ سمجھیں کہ دن کو بھی یہ میدان اسی طرح سنسان رہتا تھا۔ نہیں ! یہاں دِن کو خوب چہل پہل اور گہما گہمی رہتی تھی۔ سیکا نیر کے سینکڑوں مزدور، اُن کی بدصورت بیویاں" اور ننگے بچّے اِس میدان سے پتھر اور ریت نکالا کرتے تھے۔ اور ٹوکریوں میں بھر کر، سر پر اُٹھائے سٹیشن پر کھڑی بے شمار ویگنوں میں لادتے تھے۔ ایک عجیب ترتیب میں اور ایک عجیب نظام کے تحت یہ سارا کام ہوتا تھا۔ ٹھیکہ دار کے منشی کام کی نگرانی پر مامور تھے۔ اور جونہی اُن کی نگاہ کسی مزدور یا عورت کو سستاتے دیکھتی تو جھٹ اُس کے سر پر آ کھڑے ہوتے تھے۔

"حرامزادہ ـــــ سُور کا بچّہ۔ بیٹھ گیا ـــــ ؟"

"بابُو جی ـــــ ذرا کمر سیدھی کر رہا ہوں ـــــ"

"اور تو ـــــ چڑیل ـــــ بالنرادی! صُبح سے ایک ٹن ریت بھی تم سے نہ ڈھوئی گئی۔ شام کو سب سے پہلے ہاتھ پھیلاتی آئے گی۔ اُٹھ ری! (لات مار کر) اُٹھ !"

"آج دس ویگن بھی بھرے نہیں گئے ـــــ تو یہ کس قسم کے مزدوروں سے پالا پڑا ہے۔ بالکل کام چور ہیں ـــــ کام چور! اور نیو دہلی کی سڑک جو وائسریگل لاج کو جاتی ہے۔ سارا کام پتھر اور ریت، ریت اور مزدوروں کے لئے رُکا پڑا ہوگا۔ اگلے مہینے حضور وائسرائے لوٹنے سے آنا ہے۔

اَور ابھی تک — گاڑیاں پٹڑی پر کھڑی ہیں۔ ڈھیر نج چڑھ رہا ہے —
توبہ — ! واہگورو! —"

سارا میدان دِن بھر اسی دَور سے گزرتا ہے۔ ننگے، سُوکھے ہوئے بدصُورت مردوں عورتوں اَور بچّوں کا تانتا پُل سے سٹیشن تک لگا رہتا ہے اَور اُن کے پیچھے پیچھا جنی دَور کے محافظوں کی چمکیلی لیکن سہمی آنکھیں اُن کا تعاقب کرتی رہتی ہیں کہ کہیں نیو دہلی کی سڑک اگلے جھمیلے تک ادھوری نہ رہ جائے۔ یا گاڑیوں پہ بے ضرورت ڈھیر نج نہ چڑھ جائے۔

چُونے کی بھٹّی سے کالا کالا دُھواں عجیب سے نقوش بنایا ہوا اُڑتا جاتا ہے۔ اَور نانبائی ہلکی آنچ پہ میلے برتنوں میں باسی سالن کو اُبالتے شاید شام کو کوئی خریدار آ ٹپکے۔ اَور کتنا دِن بھر میدان میں ننگے انسانوں کے سیلاب میں گھُومتا پھرتا ہے بہتا رہتا ہے۔

سٹیشن سے چھَن چھَن کی آواز آتی ہے۔ سیٹیاں بجتی ہیں۔ جھنڈیاں لہراتی ہیں۔ ایک گاڑی آتی ہے، ایک جاتی ہے۔ ہزاروں لوگ جوان، بچے، بوڑھے، عورتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ تانگے چلتے ہیں۔ موٹریں پُوں پُوں کرنے لگتی ہیں۔ تلاشیاں ہوتی ہیں۔ محصول وصول ہوتا ہے۔ رشوتیں ملتی ہیں۔

سر پہ ٹوکریاں اُٹھائے ہوئے مزدوروں اَور بچّوں کو دیکھ کر کبھی کبھی کسی سے رہا نہیں جاتا۔ ہنس ہی دیتا ہے "گندے اِنسان ! بچّوں تک کو کام پر لگا دیتے ہیں۔ جیب کترے — !"

کبھی کبھی ٹھیکیدار کا معتبر میرے ہاتھ میں چٹ رکھ کر کہتا ہے۔
لکھئے جناب!
دس ویگن ریت ۲۸۰ ٹن نیو دھلی
چار ویگن بجری ۱۰۰ ٹن جوگندر نگر
دو ویگن پتھر ۵۰ ٹن الہ موسیٰ شکریہ بسنت میری آگ...
میں چپکے سے چٹ جیب میں ڈال دیتا ہوں۔ اور پھر شام کو ...
لگانے کے بعد ہند سے تیار کرتا ہوں۔
پتھر ۴۰۰۰ من
ریت ۸۰۶۴ من
بجری (سامان عمارتی) ۲۸۰۰ من — علےٰ ہذا القیاس —!
اس کے بعد ٹوٹی کا پل — چونے کی بھٹی — اور کالا کتا!

ایک شام کو گاڑیاں چلی گئی تھیں۔ شنٹنگ انجن ...
کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ سٹیشن پر خاموشی سی چھا گئی تھی۔ ...
میں پھر آئے تھے۔ جو شام کا دودھ پی کر بچ گئے تھے۔
محصول خانے کے سب اہلکار اپنے اپنے گھر ...
گئے تھے۔ صرف تین چپراسی سڑک پر کھڑے آنے والے نئے
افسر کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ جسے آج رات کی گاڑی سے آنا تھا
اور ساتھ ہی ساتھ کمر بندوں کے بلوں پر پرا لسو مل رہے تھے۔

"پوُرے پندرہ سو لے لیگا —"

"پھر بھی سر پر قرض ہوگا —" دوسرے نے کہا۔

"قرض؟ ہے بلے — اتنی تنخواہ پر بھی قرض؟ نشہ پیتا ہوگا!"

"اور کیا —"

"حرامی! نشہ نہیں پیتے۔ جُوا کھیلتے ہیں۔ بڑے افسر سبھی کھیلتے ہیں۔ کلب نہیں دیکھا ہے۔ تُو تو کنویں کا مینڈک ہے — مینڈک!"

"سُنا ہے ماتحتوں کو خوب پالتے ہیں —"

"ہی — ہی — ہی! خدا سلامت رکھے۔ سخت ہوگا تو سب کچھ دھرا رہ جائے گا —"

تینوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"کون ہوتا ہے بھلا؟" ایک نے بیڑی سلگا کر پوچھا۔

"ہوگا کہیں بنگال کا — آسام کا — وہاں سے پنشن (رشوت) بھی ہوگی یہاں منگائے گئے ہوں گے —" دوسرے نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہُش — پنجاب کا ہے پنجاب کا — اور پنجابی زیادہ بُرے نہیں ہوتے —" تیسرے نے دراسو ملتے ہوئے اطمینان سے کہا

"آج پتھر کی کے گاڑیاں گئیں؟"

"سترہ!"

"بس —؟"

"بے چاری لاجونتی کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ رو رہی تھی ——"

"کیوں بھلا؟"

"وہ مستری ہے نا —— وہ سکھ سالا۔ اُسی نے پیٹا تھا۔ کہتا تھا دن کی مزدوری میں سے میرا حصّہ نہیں دیا۔"

"رام۔ رام —— کتنا ظلم ہے ——"

"دیکھو! میری بیٹی کیسے چمک آ رہی ہے۔ زور سے پالش ملو۔ آج کئی افسر سٹیشن پہ آئیں گے۔"

مجھے دیکھتے ہی تینوں چُپ ہو گئے۔ میں منزلِ مقصود کی طرف بڑھا۔ میرا دِل ملول تھا۔ ہندسوں میں غلطی ہو گئی تھی۔ اور افسر نے مجھے "کام چور" کہا تھا۔

شکستہ بنچ کے نیچے میرا مونس نہ تھا۔ نانبائی حسبِ عادت چُولھے کے نزدیک بیٹھا موٹے موٹے تھوک سڑک پہ پھینک رہا تھا۔ شاید اُسے آج دمہ کا شدید دَورہ پڑا تھا۔

مَیں جنگلے کے پاس پہنچا۔ سیٹی بجائی۔ کچھ گنگنایا۔ لیکن کُتّا غائب تھا۔ پتھریلے اور ریتلے میدان کے وسط میں آگ جل رہی تھی۔

مَیں فٹ پاتھ سے ہوتا ہوا عین اُس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں نیچے آگ جل رہی تھی۔ مَیں حیران رہ گیا۔ میرا مونس پچھلی ٹانگوں پہ بیٹھا چولھے کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آٹھ دس کشمیری مسلمان

آگ کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ مٹی کی ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ بلکے بلکے پوٹھوں کا ڈھیر ایک طرف تھا۔ شاید یہ لوگ مزدوری کرنے کے لئے باہر جا رہے تھے۔

اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے اُن میں سے صرف چائے پکانے والا ہی کئی بار کشمیر سے باہر گیا ہوا ہے۔ باقی پہلی مرتبہ جا رہے ہیں۔ جبھی وہ بار بار سوکھے دریا کے پاٹ کی وسعت کو، بھاری پھر کم آہنی پُل کو اور دُور دُور کی بے رونق سی پہاڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔

"اب جموں سے نکل کر شال کوٹ (سیالکوٹ) آئیگا ۔۔۔" چائے پکانے والے نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

"اور پھر امرسر (امرت سر) وزیر آباد۔ سیملہ۔ لوفر (لاہور) اور پھر دِلی ۔۔۔"

پہلی بار جانے والے مزدور اتنے نام سُن کر حیران رہ گئے۔ اُن کی آنکھیں آگ کی روشنی میں بہت بڑی ہو گئیں۔ شاید انہیں دہلی جانا تھا "کشمیر کچھ بھی نہیں۔ دِلی دساور ہے۔ ریل گاڑی۔ ٹرام۔ چاند کا چوک۔ داس رائے کا گھر ۔۔۔ گرمی ۔۔۔ پیسہ! ہاہاہا" چائے پکانے والے نے دوبارہ کہا۔

غیر واقف ششدر رہ جاتے تھے۔ اور ہندوستان کا واقف بار بار ہانڈی کا ڈھکنا اُٹھاتا تھا۔

اُسی نے پھر کہا "دو من بوجھ اُٹھاؤ۔ تو آنہ۔ دس سیر اُٹھاؤ تو آنہ۔

سارا دن سڑک کے کام پر رہو۔ تو چودہ آنے۔ بس دن میں دو روپیہ سے کم نہیں بنتا۔ خدا کی قسم!"

غیر واقفوں میں سے ایک نے جو سب سے عمر میں کم تھا، پوچھا "چاچا! چاول ملتے ہیں وہاں ——— !"

"بہت تیری عقل! وہاں آٹا کھاتے ہیں۔ اور گھی چار پیسے کے کوٹلے خریدے۔ روٹی پکائی۔ گوشت پکایا۔ چائے تیار کی۔ نہ پھونکنے کی ضرورت۔ نہ سلگانے کی حاجت۔ نہ کپڑے کالے نہ وقت ضائع۔ اللہ اللہ خیر صلاح ——— !"

غیر واقفوں کے چہروں پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ گھی کی چمک بھی پھیل گئی۔

واقف مزدور نے دور کی پہاڑیوں کی طرف جو تاریکی سے سیاہ دکھائی دے رہی تھیں دیکھ کر کہا۔ "بخدا کشمیر دوزخ ہے۔ دوزخ۔ اب دیکھو گے دلی کیا ہے۔ کتنا بڑا شہر ہے ہر طرف دولت ہی دولت ہے۔" اتنے میں چائے تیار ہو گئی۔

سب نے اپنے سامان سے مٹی کے پیالے اور روٹیاں نکالیں۔ اور چائے پینے لگے۔ گلابی رنگ کی پتلی چائے جس میں بہت تھوڑا دودھ تھا۔

کتا چوٹھے کے اور نزدیک آ گیا۔

واقف مزدور نے چائے کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "صبح

کی روٹی شال کوٹ (سیالکوٹ)، ٹھیک ہے نا۔ رات کا سفر اچھا رہتا ہے۔"

سب نے اثبات میں سر ہلا دئے۔ بات پکی ہو گئی کہ صبح کی روٹی شال کوٹ اور رات کا سفر اچھا رہتا ہے۔

پیالیوں میں چائے ختم ہو گئی۔ واقف مزدور نے ہانڈی سے اور چائے خالی پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے کہا "آگے کشٹم (کسٹم) ہے۔ لیکن بڑے اصیل لوگ ہیں۔ واپسی پر تنگ نہیں کرتے۔ ایک دو روپے ـــــ چیکے سے اور پھر چل میرے بھائی۔ سرکار کا گھر کس نے بھر دیا ـــــ؟ ہا ہا ـــــ ہا ـــــ"

سب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ واپسی کا سارا آسمان واقف نے ایک ہی سانس میں باندھ کر رکھا ـــــ اور میرے وجود سے بے چینی اور بے تابی کا ملمع آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔ اُس کے عوض بے بسی اور بے چارگی کا خول چڑھنے لگا۔

مہاجنی نظام میں بظاہر سب اپنی اپنی جگہ مطمئن اور شاد ہیں۔ اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ حتیٰ کہ کالا ضعیف کتا بھی۔ جو روٹی کے ایک ٹکڑے کو اگلے پنجوں میں دبا کر بظاہر اطمینان سے کھا رہا تھا۔ لیکن نگاہوں میں خوف اور غیر اعتباری سی تھی۔ مزدور سامان باندھ کر اُٹھے۔ اور سڑک کی طرف آنے لگے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ چل کے فٹ پاتھ سے واپس مڑا۔

سگنل ہو گیا تھا۔ نیلے رنگ کی بتی کھمبے پر چمک رہی تھی۔ شاید گاڑی کنٹونمنٹ کے سٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔

کتا بھٹی کے مالک کی طرح سڑک پہ چہل قدمی کرنے لگا۔ اُس نے بجلی کی روشنی میں سڑک کے وسط میں اپنے محسن کے کتنے ہی بلغمی تھوک چمکتے ہوئے دیکھے۔ لیکن وہ اُن کو چاٹنے یا سونگھنے کے لئے کودا نہیں پیٹ بھرا تھا ــــ شاید اسی لئے!

اور نانبائی نے حیرت سے اُس کی حرکات دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ "آج مست ہے سالا۔ کچھ نظر نہیں آتا ــــ ٹہل رہا ہے پاجی!"

آگے آگے کشمیری مزدور مسرت میں جھومتے جھومتے اور خیرت پیں ریلوے سٹیشن کو دیکھتے دیکھتے سیالکوٹ کی سڑک پہ جا رہے تھے۔ اور اُن کے پیچھے پیچھے دِن کا "کام چور" بے ترتیبی میں، بادل نخواستہ سٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔

گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔

فسٹ کلاس ڈبے سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا نکلا۔ محصول خانے کے افسر نے اسے سلام کیا۔ اور اِس کے ساتھ ہی دو جن بھر وردی پوش چپڑاسیوں نے سلیوٹ کیا۔

نئے افسر نے آہستہ سے مسکرا دیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر محصول خانے کے افسر سے کہا۔ "کشمیر واقعی جنت ہے۔"

وہ پہلی مرتبہ پندرہ سو روپے ماہانہ پہ ریاست میں آ رہے تھے۔

وُہ ریل کے راستے سے "جنت کشمیر" میں داخل ہو گئے۔ اور پیدل راستے سے دہ جن بھر کشمیری مزدور پیٹھ پہ بوجھ اٹھائے دوزخ سے نکل گئے۔

دہلی میں نئی سڑک بن رہی تھی۔ اگلے مہینے حضور وائسرائے کو شملے سے آنا تھا۔

بیکانیر کے سینکڑوں مزدور، عورتیں، اور بچے ہر روز پتھر، ریت اور بجری سے بھری ہوئی گاڑیاں ریل کے ذریعے سے وہاں بھیج دیتے تھے۔ اور سیالکوٹ کی سڑک ہر شام سینکڑوں انسانوں کو وہاں کام کرنے کے لئے سفر کرتی ہوئی دیکھتی تھی۔

مہاجنی دور کا نظام ایسے ہی چلنا ہے۔ ایسے ہی چلتا رہیگا۔ یہاں بظاہر کوئی بھی غیر مطمئن نہیں۔ ناشاد نہیں۔ شاکی نہیں۔

اگلے سال

(۱)

ابراہیم، منشی بدرالدین کی عزت بلاوجہ نہ کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ منشی بدرالدین وہ شخص ہے۔ جو گذشتہ پندرہ برس سے اُس کا مستقل خریدار ہی نہیں بلکہ جانا پہچانا بیوپاری ہے۔ یوں تو منڈی میں حاجی بدرالدین کی ٹکر کے سینکڑوں بیوپاری تھے۔ لیکن سب کے دل کھوٹ سے بھرے ہوئے۔ وہ مال خریدنا تو جانتے تھے لیکن دل خریدنا نہیں جانتے تھے۔ ایک سال کسی سے سودا کیا۔ دوسرے سال اُس سے آنکھیں پھیر کر کسی دوسرے کو پھسلایا۔ جہاں پیسے دو پیسے کے نفع کی اُمید ہو۔

لیکن حاجی بدرالدین میں یہ عیب نہ تھا۔ وہ ایک ہی نظر سے آدمی کی انتڑیاں گن لیتا تھا۔ اپنے کام میں پورا ماہر اور ہوشیار تھا۔

لیکن جہاں کسی کی خصلت میں آشتی، صلح صفائی یا سادگی کی تھوڑی سی بھی جھلک دیکھتا تھا۔ وہیں کا ہو جاتا تھا۔ نہ مال پرکھتا نہ تول ناپ لیتا۔ صرف زبان پر اعتبار اور اکتفا کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس کا ہر سودا منفعت بخش ہوتا تھا۔ "وڈ" لینے والا زمیندار بھی راضی اور خود "وڈ" دینے والا بھی۔ اسی سبب سے اُس کے زمیندار اُس پر اپنی جان چھڑکتے تھے۔ جو کچھ اُن کے کھیتوں سے نکلتا تھا۔ اُس سے آگے رکھتے تھے۔ فصل پھولوں ہی میں ہوتی تھی۔ اور فقیر بدرالدین اپنے کسانوں کے ہاں یا خود آنا جانا شروع کرتا تھا یا اپنے کارندے بھیجتا تھا۔ اُن سے قیمتیں طے ہوتی تھیں۔ سودے ہوتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعے پر بھی جب کسان ہر طرف سے نا اُمید ہوتے۔ تو اُن کی حاجت روائی بدرالدین کے سوا دوسرا نہ کرتا تھا۔ بعض اوقات ایسے موقعوں پر وہ اگلے دو برس کی فصلوں تک کا سودا کر لیتا تھا۔ حاجت مند زمیندار کو اُس وقت بدرالدین فرشتے سے کم نہ دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے نزدیک شاید فرشتے کی یہی پہچان تھی۔ جو وقت پر حاجت روائی کرے۔ اور ہونے والی فصلوں کی "وڈ" خدا کے توکل پر دے آئے۔

ابراہیم کو وہ دن یاد تھا۔ جب بدرالدین دیسی لٹھے کا کُرتہ اور سر پر پانچ آنے والی ٹوپی پہنے اُس کے پاس آیا۔ ابراہیم اپنی بیوی اور بچوں سمیت کھیت سے آلو نکال رہا تھا۔ بدرالدین کھیت کے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ اور جو ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اُسے آلوؤں کو دیکھنے لگا۔ اُس سال فصل بھی خدا کے

فصل سے اچھی تھی۔ ابراہیم مسرت کی پینگوں میں جھول رہا تھا۔ ایک نوجوان سفید پوش کو کھیت کے کنارے کھڑا دیکھ کر اُس کا دِل بھر آیا۔ بیٹے سے بولا "سیر بھر آلو اِسے بھی دے دو۔ جانے کس خانقاہ کا دربان ہے۔"

اُس کی بیوی نے ٹوک کر کہا۔ "کیا ساری فصل اب ان درویشوں ہی کی نذر کر دو گے؟"

ابراہیم نے مُسکرا کر کہا۔ "سوالی ہمیشہ خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اِسے بھرے کھیت سے نا اُمید لوٹا دینا اچھا نہیں۔"

بیوی نے اپنے بیٹے کے ہاتھ سے آلوؤں کی ٹوکری لیتے ہوئے خاوند سے کہا۔ "گھر بار تو نہیں لُٹانا ہے۔ جن کے پاس دولت ہے۔ وُہ کسی پر تھوکتے بھی نہیں۔ رہنے دو یہ فیاضیاں!"

ابراہیم نے گرج کر کہا۔ "کیا کرتی ہو؟ اگر زمیندار ہی کی نظر پست اور ظرف تنگ ہو۔ تو دُنیا میں خیراتیں کون کرے؟ خدا دولت اِس لئے نہیں دیتا کہ اُس کے بندوں پر دروازہ بند کر دیا جائے۔"

بدرالدین اب کھیت کے کنارے کھڑا میاں بیوی کی بحث سُن رہا تھا۔ وُہ ٹہلتے ٹہلتے اُن کے نزدیک آ گیا۔ اور بولا "تم نے مجھے بھی سُوالی ہی سمجھا۔ اِس لئے کہ میرے بدن پر نفیس کپڑے نہیں۔"

ابراہیم نے مُسکرا کر بے پروائی سے کہا۔ بابا فصل کاٹنے کے موقع پر جو بھی میرے کھیت میں آیا۔ سُوالی ہی تھا۔ شہنشاہ نہ تھا۔ تم ناراض کیوں ہو گئے۔ یہ قسمت کا کھیل ہے۔"

بدرالدین کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے کہا "دراصل کسان بے وقوف ہوتا ہے۔ . . . . . . "

ابراہیم نے دوبارہ مسکرا کر کہا۔ "ٹھیک ہے بے وقوف نہ ہوتا۔ تو شہر میں بڑی بڑی توندیں نکالے بیوپاری نہ ہوتے۔ یہ ہم لوگ ہی بے وقوف ہیں۔ جو اپنی بستی اُجاڑ کر اوروں کی بستیاں آباد کرتے ہیں۔ سچ ہے بابا۔ کسان دراصل بے وقوف ہوتا ہے۔"

بدرالدین نے کہا "تم لوگوں کو آدمی پہچاننے کا شعور نہیں کسی کے بدن پہ موٹا لباس دیکھا۔ جھٹ اُس کی آبرو سے کھیلنے لگے۔"

ابراہیم نے درانتی کو ہاتھ میں اُچھالتے ہوئے کہا "تم میرے والد جیسی کی طرح بڑے تیز مزاج معلوم ہو۔ سچی بات کہہ دی۔ اور تم آپے سے باہر ہونے لگے۔"

بدرالدین نے کہا "خدا خیر کرے۔ بہت اترائے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ آنکھوں پہ اِس قدر مستی چھائی ہوئی ہے کہ بیوپاری اور سوالی میں فرق ہی نہیں کر سکتے۔"

ابراہیم نے قہقہہ لگا کر پوچھا "تم بھی بیوپاری ہو؟"

بدرالدین نے کہا "بیوپاری کے سر پہ سینگ ہوتے ہیں کیا؟"

ابراہیم اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ بے پرواہی سے بولا "سینگ نہیں ہوتے۔ اُس کے پاس روپوں کی تھیلیاں ہوتی ہیں۔ وہ خود نہیں بولتا۔ تھیلیاں بولتی ہیں۔"

بدرالدین ہونٹ چبانے لگا۔ ابراہیم نے اُس پر ایسی چوٹ کی تھی جس کا اُس کے پاس جواب نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک آلو کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بدرالدین نے پوچھا "سودا کر و گے؟" ابراہیم نے حیران ہو کر پوچھا "کیا بھاؤ لو گے؟"

اب تک ابراہیم کو یقین تھا۔ کہ بدرالدین مذاق کر رہا ہے۔ اِسی لئے اُس نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

بدرالدین نے پوچھا "کتنے آلو نکلیں گے تمہارے کھیت سے؟"

ابراہیم کو اب پورا یقین ہو گیا۔ کہ بدرالدین ٹھٹول کر رہا ہے۔ اُس نے دوبارہ طنزاً کہا "کھیت تمہارے سامنے ہیں۔ اور یہ سوال تم بیوپاری ہو کر مجھ سے پوچھ رہے ہو؟"

بدرالدین نے سرسری نگاہوں سے کھیت کا جائزہ لیا۔ اور کہا "یہ سب کھیت تمہارے ہی ہیں۔"

ابراہیم نے کہا۔ "شکر ہے مالک کا!"

بدرالدین نے کہا "سو من سے زیادہ نہ نکلیں گے۔ جی چاہے تو ابھی سودا کر لو۔"

ابراہیم نے مسکرا کر کہا "بڑے بیوپاری نکلے۔ تم ایسے دو چار بیوپاری اور ہوں۔ تو کسانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔"

بدرالدین نے سر کھجلاتے ہوئے کہا "خیر جتنے بھی نکلیں۔ تین روپے من کے حساب سے لوں گا۔ کہو منظور ہے؟"

ابراہیم اور اُس کی بیوی تین روپے من کا سودا سُن کر للچا گئے۔
اُس کی بیوی نے درانتی زمین پر رکھتے ہوئے اور زیرِ لب
مسکرا کر بدرالدین سے کہا "آج کل آلو بارہ روپے خروار بکتے
ہیں۔ آپ کیا دے رہے ہیں ہمیں!"
بدرالدین نے کہا "دیدی! یہ ٹھیک ہے۔ لیکن جب تک ہمیں
بھی ٹکا آنہ نفع نہ ہو۔ ہم کن کے گھر ٹکڑے توڑیں۔"
ابراہیم نے کہا "کسر کھاؤں گا لیکن قیمت یکمشت لوں گا"
بدرالدین نے کہا "ابھی لے لو۔ مرضی ہو تو اگلے سال کا سودا
بھی کر رکھو۔ اور قیمت لے رکھو۔"
اگلے سال کا لفظ سُن کر ابراہیم چونک پڑا۔
اُس نے حیرت بھری نظروں سے بدرالدین کو دیکھ کر کہا۔
"اگلے سال کا سودا؟"
بدرالدین نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہاں"
ابراہیم نے پوچھا "اگر اگلے سال فصل اچھی نہ ہوئی۔ تو ----؟"
بدرالدین نے مسکرا کر کہا "وہ میری قسمت ہے۔ تم کو اُس
سے کیا غرض۔ تم اپنی قیمت لے لو۔"
اُس وقت ابراہیم اور اُس کی بیوی کو بدرالدین فرشتے سے زیادہ
پاکیزہ دکھائی دیا۔ جو محض اپنی قسمت کے توکل پر اُنہیں اگلی فصل
کی قیمت دے رہا تھا۔

سودا طے ہونے کے بعد بدرالدین نے مسکرا کر پوچھا "اب آدمی پہچان سکو گے؟"
ابراہیم زیرِلب مسکرایا۔ اور سر جھکا دیا۔

(۲)

شروع شروع میں بدرالدین ایسا بدقسمت تھا کہ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا نقصان اٹھایا۔ آخر چاروں طرف سے ناامید ہو کر اس نے آلوؤں کا بیوپار شروع کیا۔ ان دنوں آلوؤں کی بہت مانگ تھی۔ نرخ روز بروز بڑھتے جاتے تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے آلوؤں کا معمولی سوداگر دنوں میں سیٹھ بن گیا۔ اس کی حیثیت، امارت اور چمکتی ہوئی تجارت کو دیکھ کر بدرالدین کے منہ میں پانی بھر آیا۔ منڈی کے نکڑ پر ایک چھوٹی سی دکان کھولی۔ تھوک اور پرچون دونوں طرح سے آلو بیچنے لگا۔ ابراہیم کے آلو اس نے تین روپے من کے حساب سے لئے۔ ہاتھوں ہاتھ وہ پانچ روپے من کے حساب سے فروخت کئے۔ ایک ہی سودے میں دو ڈھائی سو روپے کا منافع دیکھ کر اس نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ شروع شروع میں نقد قیمت دے کر سودے کرتا تھا۔ جب مزا آیا۔ تو "وٹہ" پر بھی سودے کرنے لگا۔ کسان اس راز کو نہ سمجھ سکتے تھے۔ وہ نقد روپے دیکھ کر ہی جھومتے تھے۔ لیکن بدرالدین کی نظروں سے کچھ بھی اوجھل نہ تھا۔ فصل کاٹنے کے موقع پر

وُہ کھیتوں میں جاتا۔ اَور اپنی نگرانی میں آلو نکلواتا۔

وُہ کِسان جو اُس کے ساتھ سودے کرتے تھے۔ جہاں تھے وہیں رہے۔ لیکن بدرالدین چند سالوں ہی میں شیخ بدرالدین بن گیا۔ پھر حاجی بدرالدین۔ پھر سیٹھ بدرالدین۔ نکڑ کی دُکان اَور سے اَور ہو گئی۔ ایک طرف ایرانی قالین بچھا تھا۔ اس پر ایک گاؤ تکیہ رکھا گیا۔ جس کا غلاف سبز مخمل کا تھا۔ کچھ گاؤ تکیے رکھ لئے گئے۔ دن بھر حاجی بدرالدین اپنی دکان پر بیٹھتے لاریاں سامنے کھڑی ہو جاتیں۔ وُہ اپنی نگرانی میں آلو بھرواتے۔ کبھی کبھی کسان دکان پر آتے۔ تو پاؤں صاف کر کے دُور کونے میں بیٹھ جاتے۔ جب حاجی صاحب کو موقعہ ملتا۔ اُن سے بھی دو چار باتیں کر لیتے۔ اب نہ وُہ دیسی لٹھے کا کُرتہ تھا۔ اَور نہ پانچ آنے والی ٹوپی۔ ان کی جگہ ریشمی پیرہن چھبیس نمبر کی ململ اور دوشالے نے لے لی تھی۔

ابراہیم کبھی کبھار دُکان پہ آتا۔ تو حیران رہ جاتا۔ اپنی اُس غلطی پر جو اُس نے پہلے دِن بدرالدین کو دیکھ کر کی تھی۔ اکثر نادم ہوتا۔ اُس کے دِل میں صرف ایک ہی مسرّت تھی۔ کہ بدرالدین اِنسان نہیں فرشتہ ہے۔ اور وُہ خود کس قدر خوش نصیب جس کا کاروبار ایسے نیک خصلت اِنسان سے ہو۔

(۳)

پندرہ برس بیت چکے تھے۔ آلوؤں کی قیمت اِس سال خلاف توقع

بڑھ گئی تھی۔ بدرالدین کا کارندہ سودا کرنے کے لئے ابراہیم کے ہاں آگیا۔ چائے وغیرہ پلا کر ابراہیم نے مسکرا کر کہا ''اس سال آپ کو ''وڈ'' میں اضافہ پڑے گا منشی جی!''

کارندے نے بے پروائی سے پوچھا ''کیوں بھلا؟''

ابراہیم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ نہیں جانتے؟ کتنے بھولے بنتے ہیں۔''

کارندے نے پوچھا۔ ''پھر بھی۔''

ابراہیم نے کہا ''آلوؤں کی قیمت جو بڑھ گئی ہے۔''

کارندہ زور سے ہنسا اور کہا۔ ''خوب! جب قیمت گھٹ گئی تھی۔ اس وقت بھی کچھ کہا تھا؟''

ابراہیم نے چلم پر آگ رکھتے ہوئے کہا۔ ''خدا کی قسم آج تک ایسا سودا ہمارے ساتھ نہیں ہوا جس میں نرخ بازار سے آپ نے ہمیں زیادہ دیا ہو۔''

کارندے نے پوچھا۔ ''پھر سودا نہ کروگے؟''

ابراہیم نے جلد جلد کہا ''انشاء اللہ کروں گا لیکن ظلم نہ ہو۔ حاجی صاحب میرا پندرہ برس کا جانا پہچانا بیوپاری ہے۔''

کارندے نے پوچھا۔ ''کس بھاؤ پر دوگے اس سال؟''

ابراہیم نے کہا۔ ''حضرت اس سال آلو سولہ روپے خروار بکتے ہیں۔ آگے آپ مالک ہیں۔ جو چاہیں دے دیں۔''

کارندے نے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ منڈی کی ہوا لگ گئی ہے۔ جبھی قیمتیں یاد رکھی ہیں۔"

ابراہیم نے کہا "خدا کی قسم! یہ بات نہیں۔"

کارندہ سنجیدگی سے مُسکرایا اور کہا "بے وقوف! حاجی صاحب جیسا بیوپاری خواب میں بھی نہ ملے گا۔ جو فصل بونے سے پیشتر ہی تمہاری باتوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ اور تھیلیاں تمہارے حوالے کرتے ہیں۔ پھر بھی تم احسان فراموش بنتے ہو۔"

ابراہیم نے کہا "لاحول ولا قوۃ! ہم اُن کا نمک پندرہ سال سے کھا رہے ہیں۔ کس منہ سے اُن کی ناشکرگزاری کریں۔"

کارندے نے پچاس روپے کے نوٹ اُس کے سامنے رکھے۔ اور کہا۔ یہ ہونے والی فصل پر پیشگی ہے۔ ہوسکا تو میں بھی حاجی صاحب سے اِس سال قیمتوں میں دو چار آنوں کا اضافہ کرنے کے لئے کہونگا۔ لیکن اِس پر زیادہ بھروسہ نہ رکھنا۔ سمجھے!"

ابراہیم نے حیرت بھری نگاہوں سے سامنے پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھا۔ اور پھر پوچھا "آپ نے کیا بھاؤ مقرر کیا منشی جی؟"

کارندے نے مُسکرا کر کہا "آج نئے بھاؤ مقرر کرنے ہیں۔ نادان جو بھاؤ پچھلے سال تھے۔ وہی ملیں گے۔ ہاں حاجی صاحب کچھ اضافہ کردیں تو الگ بات ہے۔"

ابراہیم نے بے دلی سے کہا "نہیں منشی صاحب! یہ ظلم ہے۔

مَیں چھ روپے میں خروار نہیں دے سکتا۔ اتنا خسارہ برداشت کرنے کی مجھ میں نہ طاقت ہے نہ توفیق۔"

لیکن کارندے نے کچھ نہ مانا۔ اُس نے نوٹ وہیں رکھے۔ اور چلا گیا۔

(۴)

رات کو ابراہیم سو نہ سکا۔ سوچتا رہا۔ "کتنا ظلم ہے۔ بازار میں آلو سولہ روپے کے حساب سے بکتے ہیں۔ اور مجھے چھ روپے کے حساب سے دینے ضروری ہیں۔ صرف اِس لئے کہ بیوپاری نے مجھے فصل بونے سے پیشتر قیمت ادا کی۔ اِس طرح سے وُہ مجھے اپنی محنت کا اندازہ ہی لگانے نہیں دیتا۔ آخر اتنی محنت جو کرتا ہوں کس لئے؟ اِس لئے کہ اپنے خون سے بیوپاری کا پیٹ بھروں۔ اور خود سُوکھ کر کانٹا ہو جاؤں پندرہ سال پہلے کرتہ پہننے والا بدرالدین آج حاجی بن کر میرے ساتھ سودا کرنے کے لئے اپنے کارندے بھیجتا ہے۔ اور مَیں جہاں تھا۔ وہیں ہوں۔ نہ محمد ابراہیم بنا۔ نہ ابراہیم خان! نہ بدن سے میلا کُرتہ گیا۔ اور نہ کبھی نئی ٹوپی خریدنے کی توفیق ہوئی۔ اُس نے میری محنت سے لاکھوں روپے بنائے صرف اِس لئے کہ اپنی محنت کی قیمت دُنیا سے طلب کرنے کا مجھے شعور نہیں۔ اور بیوپاری میری نااہلیت سے فائدہ اُٹھاکر اپنے لئے دونوں دُنیا حسین بنا رہا ہے۔

صبح وُہ اُٹھا۔ بیوی سے بولا" کل والے روپے کہاں ہیں؟"
بیوی نے پُوچھا" کیا کرو گے؟"
ابراہیم نے کہا۔" مَیں بدرالدّین سے سودا نہ کروں گا۔"
بیوی نے حیران ہو کر پُوچھا۔" کیوں؟"
ابراہیم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔" وُہ قصائی ہے۔ مُردار خور ہے۔ اُس کی سانس سے نعش کی بُو آرہی ہے۔"
بیوی خاوند کا غصہ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ بولی۔" تم کو ہوش بھی ہے کہ نہیں۔"
ابراہیم نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔" جب ہوش میں آؤں گا پھر تم ہی کیا ساری دنیا مجھے دیوانہ کہے گی! لا روپے!"
بیوی نے چھاتی پیٹتے ہوئے کہا۔" تم کو کیا ہو گیا۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔"
ابراہیم غصّے سے کانپ رہا تھا۔ اُس نے گرج کر کہا" مَیں محنت کروں گا۔ اور دُنیا مجھے اُس کی واجب قیمت ادا نہ کرے گی۔ تو اُس کی چھاتی پر مونگ دلوں گا۔ پسلیوں میں بھالے چبھو دُوں گا۔ سمجھی! لا روپے!"
بیوی نے آہستہ سے کہا۔" اُس جیسا بیوپاری نہ ملے گا۔ نہ لوٹاؤ روپے پچھتاؤ گے۔ آخر اُس کا کیا قصور ہے۔ اپنی تقدیر کو نہیں روتے۔ جس نے اُبھرنے نہ دیا۔"

ابراہیم کے سینے پر جیسے کسی نے ہتھوڑا مارا۔ گرج کر کہا۔ "تقدیر! اُس نے مجھے چند چمکتے ہوئے سکّے دیئے اور مبہوت کر دیا۔ مجھے کبھی بھی اُبھرنے نہ دیا۔ پھر بھی وہ بیوپاری ہے فرشتہ ہے۔ اور میں شیطان۔ جو اپنی محنت کے دام مانگ رہا ہے۔ جو خیرات نہیں مانگتا۔ قیمت طلب کرتا ہے۔"

بیوی نے اُس کا مصمم ارادہ دیکھ کر مٹّی کی ہانڈی سے نوٹ نکالے۔ اور اُس کے سامنے رکھ دیئے۔ ابراہیم نے نوٹ جیب میں ڈالے اور جاتے جاتے کہا۔ "ہمیں بھی بدرالدین کی طرح آلو بیچنے کا ڈھنگ آتا۔ تو ہمارے گھر پر بھی دھن برستا۔ ہم بھی حج کر آتے۔ انسان کہلاتے بھائیں بھائیں کرنے والی یہ ناداری یہاں ڈیرا ڈالے نہ رہتی۔ خون پسینہ ہم بہائیں اور ہاتھ رنگے وہ قصائی۔ اور پھر واجب دام طلب کرنے پر نخرے کرے۔"

(۵)

حاجی بدرالدین دکان پر تکیئے کے سہارے قالین پر بیٹھے تھے۔ اُن کے سامنے دکان کے کارندے گذشتہ سال کا حساب کر رہے تھے۔ صرف آلوؤں کی تجارت میں اُنہیں ساڑھے گیارہ ہزار روپے کا منافع رہا تھا۔

اسی وقت ابراہیم آ گیا۔ رتبے کے مطابق ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

حاجی بدرالدین نے پیچوان کا کش لگاتے ہوئے کہا "ساڑھے گیارہ ہزار روپے کا منافع کوئی بڑا منافع نہیں۔ مجھے پندرہ ہزار سے زیادہ کی توقع تھی۔"

کارندے ایک دوسرے کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ جیسے یہ سارا منافع اُنہی میں بانٹنے کے لئے تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد بدرالدین نے ابراہیم سے پوچھا "آج کیسے آنا ہوا؟ سُنا ہے تم نرخوں کے اضافہ پر بہت زور دے رہے ہو؟"

ابراہیم نے سر جھکا کر کہا۔ "سچ ہے حضرت! اِس سال میرا پیٹ بہت بڑا ہو گیا۔"

بدرالدین نے مسکرا کر طنزاً کہا۔ "تو علاج کراؤ اِس کا! آج کل ڈاکٹر عام ہو گئے ہیں۔"

ابراہیم نے زہر خندہ کیا اور اپنا غصہ آپ پی کر بولا "جب آپ ایسے بزرگ ہم غریبوں کا یہی چاہیں۔ تو ہمارے حق میں دُعا کون کرے۔"

بدرالدین نے قہقہہ لگا کر دُوسرا کش لگایا۔ اور پھر ایک کارندے سے بولا "بڑا حضرت ہے۔ جب تک ہم سے پُورے دام نہیں لیتا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

ابراہیم نے آہستہ سے کہا۔ "جبھی آج بھی آیا ہوں کہ پیٹ بھر کر روٹی کھانے کی اُمید تو ہو جائے۔"

بدرالدین نے آہستہ سے اور سنجیدگی اختیار کر کے کہا "ابراہیم اس سال قیمت میں اضافہ نہ ہوگا۔ خدا نے چاہا۔ اگلے سال اس پر سوچیں گے۔"

ابراہیم کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے پچاس روپے کے نوٹ نکالے۔ اور بدرالدین کے سامنے رکھے۔ اور خود اٹھتے ہوئے کہا "اِس سال سودا ابھی نہ ہوگا حضرت! خدا نے چاہا اگلے سال کریں گے۔"

حاجی بدرالدین اور اُن کے کارندے اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ اور وہ چلا گیا ۔

میراحق

(۱)

جس دِن شنکرداس لاہور سے پریس لے آئے۔ عبدل بازار میں مزدوری کی تلاش میں کھڑا تھا۔ ہمسائگی میں رہنے کی وجہ سے اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ شنکرداس کوئی کارخانہ کھولنے والا ہے لیکن اُسے یہ وہم وگمان تک نہ تھا کہ شنکرداس کی مردم شناس نظر اُسے ہی کارخانہ کے اہتمام کے لئے منتخب کرے گی۔ چنانچہ جب پہلی بار شنکرداس نے اُس سے کہا۔ "مزدوری کرو گے؟" تو عبدل ششدر رہ گیا۔ وہ گھاٹ سے لکڑیاں۔ پتھر اور دھان ایسی چیزیں ڈھونے کا عادی تھا۔ اُس نے جواب میں کہا۔ "زمستان کے لئے سامان لے آئے گیا ؟"

شنکرداس نے ہنس کر کہا۔ "بے وقوف! سامان نہیں پریس لے آیا ہوں۔"

عبدل نے اُس وقت تک پرلیس کا نام نہ سُنا تھا۔ اُس نے حیرانی سے پوچھا" پرلیس۔ پرلیس کیا؟"
شنکر داس نے کہا" ارے چھاپہ خانہ۔ نہیں جانتے کیا؟"
عبدل نے یونہی کہہ دیا" سمجھ گیا۔ لیکن کام کیا ہوگا؟"
شنکر داس نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا" مَیں سب کچھ سمجھا دونگا۔ دِنوں میں ماہر بنا دوں گا۔ پورا انجینئر!"
عبدل تو پہلے مسکرایا۔ اور تھوڑی دیر بعد سوچ کر پوچھا" مزدوری کیا ملے گی؟"
شنکر داس اُس کی خاموشی تاڑ گیا تھا۔ سنجیدگی سے بولا" وہ تم مجھ پر چھوڑو۔ خدا نے چاہا۔ تو راحت ہی پاؤ گے۔ نہ دِن بھر کی دربدری ہوگی۔ نہ پُل پر نیندیں ہی کھو گے۔ کہو منظور ہے؟"
عبدل نے کہا" آپ پرائے تو نہیں۔ گھر کا سارا حال آپ کے سامنے ہے۔ ذرا ذرا سے بچے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ دھوبی کا کُتا بن جاؤں۔"
شنکر داس نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" پرایا ہوتا۔ تو کیا مجھے مزدور ہی نہ ملتے۔ تمہاری تنگدستی دیکھ کر مَیں نے سوچا۔ کیوں نہ تمہیں ہی کام پر لگا دوں۔ حق ہمسائگی بھی ادا ہوگا۔ اور تم بھی پریشانیوں سے نجات پاؤ گے۔"
عبدل نے کاندھے پر لٹکتے ہوئے لمبے سے تھیلے کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔" تو گھر والی سے نہ پوچھوں؟"

شنکر داس نے کہا۔ "پوچھ لو۔ لیکن ضرورت ہی کیا ہے۔ اُسے بچّوں کے لئے روٹی چاہئیے۔ وہ تو تم مزے سے پیدا کر لوگے۔"
عبدُل کو شنکر داس کی بات صحیح معلوم ہوئی۔ اُس نے کہا۔ "چلئیے۔ آج سے میں آپ کا ہو گیا۔"

(۲)

شنکر داس تجربہ کار آدمی تھا۔ اُسے عبدُل کی دیانت داری پر پُورا بھروسہ تھا۔ جبھی اُس نے عبدُل کو منتخب کیا۔ یہ صحیح تھا کہ عبدُل مزدوری زیادہ مانگتا تھا۔ لیکن اُس کے دِل میں کھوٹ نہ تھا۔ محلّے کی بہو بیٹیاں اپنا ضروری سامان اُسی کے ذریعے سے منگا لیتی تھیں۔ کیا مجال جو اُس نے کسی کا پیسہ مارا ہو۔ یا اُن کی بات کسی پر ظاہر کی ہو۔ وہ سب کو اپنی بیٹیوں کی طرح دیکھتا تھا۔ اگرچہ افلاس میں یہ چیزیں عنقا ہوتی ہیں۔ لیکن عبدُل نے ابتدا ہی میں اپنے من کو مار لیا تھا۔ وُہ اپنے زورِ بازُو سے حلال کی روزی کماتا تھا۔ اور اپنے کنبے میں سکوُن کی زندگی بسر کرتا تھا۔
شنکر داس نے اُسے پریس کا کام دنوں میں سکھا دیا۔ مشین کو چلانا پتھر کو گرم کرنا۔ کاپی جمانا۔ مشین کے باریک پُرزوں کی صفائی کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کام بن گیا۔ کارخانے میں جتنے مزدور کام کرتے تھے۔ سب اُس کی نہ صرف عزّت ہی کرتے۔ بلکہ اُنہیں اُسکا خوف بھی

تھا۔کوئی مزدور کام پر دیر سے آتا۔ تو عبدل اس کی وہ فضیحتی کرتا کہ بے چارا پانی پانی ہو جاتا۔

شنکرداس پریس کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھے رہتے۔خریدار اُن کے پاس کام لے کر آجاتے۔شنکرداس اُن سے اُجرت طے کرتے۔اور دِن میں کسی وقت کارخانے میں بھی چلے آتے۔عبدل کو کام میں مصروف دیکھ کر وہ دِل ہی دِل میں جھوم اُٹھتے۔

شام کو کارخانے میں چھٹی ہوتی۔مزدور ایک دُوسرے کے ساتھ ٹھٹھا مخول کرتے ہوئے چلے جاتے۔عبدل کپڑے بدل کر شنکرداس کے پاس چلا جاتا۔اور کہتا۔"آپ ابھی تک کام کر رہے ہیں؟ کارخانہ تو بند ہو گیا۔"

شنکرداس مسکرا کر جواب دیتے۔"کیا بجا ہوگا؟"

عبدل دُور صحن کی طرف اِشارہ کر کے کہتا۔"دُھوپ تو وہاں نکل گئی۔ سات یا ساڑھے سات بجے ہوں گے۔"

شنکرداس صندوق میں کاغذات بند کر کے اُٹھتے۔اور عبدل کے ساتھ باتیں کرتے کرتے پھاٹک سے باہر چلے جاتے۔عبدل کارخانے کے برآمدے میں چٹائی بچھاتا۔حقے میں تازہ پانی ڈالتا۔اور اندھیرا چھا جانے تک وہیں بیٹھ کر تمباکو پیتا۔اُس وقت اُسے اپنا آپ مزدور کی حیثیت میں نہیں بلکہ مالک کی حیثیت میں دکھائی دیتا۔پریس کی کوئی چیز باہر پڑی پاتا۔تو جھٹ سے اُٹھا کر حفاظت کے ساتھ رکھتا۔رات

کا کھانا اُسے گھر ہی سے پہنچ جاتا۔ کبھی کبھار جی چاہتا۔ تو بچّوں کو دیکھنے کے لئے گھر چلا جاتا۔ ورنہ رات اور دِن کارخانے ہی میں رہتا۔ دِن کو مزدوری کرتا اور رات پہرے داری۔

(۳)

پہنپ کے سامنے تھوڑی سی زمین تھی۔ لیکن ناہموار اور گھاس پھونس سے بھری ہوئی۔ یہ زمین شنکر داس کی اپنی تھی۔ زمین کے اِردگرد کھائی تھی۔ جس میں بارش کا پانی جمع رہتا تھا۔ ایک دِن جب کارخانہ بند ہو گیا۔ عبدُل احاطے میں ٹہل رہا تھا۔ آسمان پہ چودھویں کا چاند تھا۔ نکھری ہوئی چاندنی میں بے ترتیبی سے اُگی ہوئی گھاس اور ناہموار زمین اُسے اچھی نہ دِکھائی دی۔ اُس نے من میں سوچا اگر یہاں پھولوں کی کیاریاں لگیں اور کنارے کنارے میوہ دار درخت۔ تو احاطہ کتنا خوبصورت دِکھائی دے گا۔ خریداروں پہ کام دھندے کی صفائی ہی کا صرف اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ وُہ شاندار مکان، خوبصورت باغ اور سجا سجایا سامان دیکھ کر بھی مرعُوب ہوتے ہیں۔

اُس نے اُسی وقت کپڑے اُتارے۔ گرمیوں کے دِن تھے۔ چاندنی تھی وُہ چکور کی طرح مست ہو کر احاطہ صاف کرنے لگا۔ اُس نے اُونچی اُونچی جگہیں ہموار کیں۔ گھاس پھوس کو ایک جگہ جمع کیا اور اُس میں آگ لگا دی۔ صُبح تک سارا احاطہ صاف ہو گیا۔ اُس وقت اُسے

اپنا جسم ٹوٹا ٹوٹا سا محسوس ہوا۔ لیکن روح اطمینان اور مسرت سے لبریز۔
دوسرے دن مزدوروں نے احاطہ دیکھا۔ تو سب حیران رہ گئے۔
اُنہوں نے ایک دوسرے سے کہا۔ "یہ چاچا عبدل کے سوا اور کسی کا کام نہیں۔ احاطہ کیا ہے۔ گلزار بنا دیا ہے۔" اور جب شنکرداس بھی آ گئے۔ تو احاطے کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر وہ بھی ششدر رہ گئے۔ اُنہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ یہ احاطہ اُنہوں نے شام کو دیکھا تھا۔ وہ یہ نہ تھا جس میں وہ اس وقت کھڑے تھے۔ اُنہوں نے کارخانے کی طرف دیکھا۔ عبدل برآمدے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔
شنکرداس آہستہ آہستہ احاطے کو دیکھتے ہوئے اُس کی طرف بڑھے اور برآمدے کے پاس پہنچ کر بولے۔ "عبدل! احاطہ کس نے صاف کیا ہے؟"
عبدل نے ہنس کر کہا۔ "آپ کے غلام نے۔"
شنکرداس نے تعجب سے پوچھا۔ "کب؟"
عبدل نے کہا۔ "رات کو چاندنی میں!"
شنکرداس فرطِ عقیدت سے اُس کے قریب گئے۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ "تم اِتنا کام کیوں کرتے ہو عبدل؟ کیا تم مجھے احسان سے اِس قدر دبا رکھو گے کہ دوسری دُنیا میں بھی نہ اُتار سکوں۔"
عبدل نے مسکرا کر کہا۔ "احسان کیسا؟ آخر آپ کا نمک کھاتا ہوں۔

آپ نہ کے لئے جان نہ توڑوں - تو کس کے لئے توڑوں -"

شنکر داس نے اُسی طرح کہا - "مزدور لگا لیا ہوتا !"

عبدل نے سنجیدگی سے کہا - "جب تک میرے بازوؤں میں طاقت ہے - مجھے مزدور کی کیا ضرورت ہے - اور تو اور میں کہاں کا راجا ہوں - جو محنت کرنے میں شرم محسوس کروں -"

شنکر داس نے کہا - "لیکن احاطے کو صاف کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی - اگر ہوتی بھی تو میں نہ کرا سکتا تھا ؟"

عبدل نے احاطے کے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا - "اس کی بڑی ضرورت تھی صاحب ! ابھی تو یہاں کیاریاں بنیں گی - پھول اُگینگے - سبزہ اُگیگا - میوہ دار درخت لگیں گے - اُس وقت اندر کارخانے کی بہار ہوگی - اور باہر احاطے میں قدرت کی بہار -"

شنکر داس چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے - سوچنے لگے - "عبدل آدمی نہیں فرشتہ ہے - جانے پچھلے جنم میں میرا کون تھا - جو اس جنم میں جان توڑ کر میرے لئے محنت کرتا ہے -"

دوسری طرف عبدل بھی شاد تھا - جب سے اُس نے گھاٹ کی مزدوری چھوڑی تھی - اُس کے گھر پر دھن برس رہا تھا - ننھے ننھے بچے جو اُن دنوں نابالغ تھے - اب پیٹ بھر کر دونوں وقت روٹی کھاتے تھے - اُن کے بدن پر پیرہن بھی تھا - اور سر پر ٹوپی بھی - یہی اُن کے والدین کے نزدیک سب سے بڑی خوشی اور اطمینان کی بات تھی -

(۴)

پریس میں کام کرتے کرتے عبدل کو پندرہ برس بیت چکے تھے۔ اب اُس میں وہ طاقت نہ تھی۔ جو پریس قائم ہونے کے وقت تھی۔ اُس کی تمام قوّت پریس کی اِنہی کلوں نے کھائی تھی۔ وُہ اب اِنہماک اور مستعدی سے کام نہ کر سکتا تھا۔ صرف یا تو دِن بھر برآمدے میں پڑا رہتا۔ یا احاطے میں جہاں اُس نے باغیچہ لگایا تھا۔ اگرچہ اُس کی طاقت زائل ہو چکی تھی۔ لیکن شنکرداس کے لئے عقیدت اور اُن کے پریس کی محبّت اُس کے دِل میں بدرجہ اَتم موجود تھی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ شنکرداس بھی بُوڑھے ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے ضعیفی کے سبب پریس میں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور سارا کام اپنے بیٹے کے سپُرد کر دیا تھا۔ اور وُہ بھی اُس وقت جب اُنہوں نے عبدُل کے دو بیٹوں کو پریس میں نوکر رکھا۔ عبدُل اُس دِن سے شنکرداس کا زیادہ احسان مند ہو گیا تھا۔ وُہ اپنے خون کا قطرہ تک پریس ہی میں بہانا چاہتا تھا۔ جب کبھی پریس کا کوئی پُرزہ خراب ہو جاتا۔ وہ جھٹ سے اُسے ٹھیک کر دیتا۔ کوئی مزدور چھپائی کے کام میں نقص پیدا کرتا۔ تو وُہ اُس کی کھال کھینچتا۔ لیکن گوپی ناتھ پر اِن باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ وُہ نئی وضع کا جوان تھا۔ باپ کے قائم کئے ہوئے کارخانے کی وجہ سے اُسے آج کل کے نوجوانوں کی طرح نوکری کے لئے پریشان نہ ہونا پڑا تھا۔ یہی اُس کی مستی کا

سمجھنا تھا۔

شنکر داس کارخانے میں ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہ کرتے تھے۔ لیکن گوپی ناتھ اس کے برعکس آٹھ آنے کے سگریٹ ہی دن میں پی جاتا تھا۔ اِس عادت کو روکنے کے لئے عبدل نے ایک بار اُس سے کہا بھی۔ لیکن گوپی ناتھ نے آگ بگولا ہو کر جواب دیا "تم کو میرے اخراجات سے کیا غرض! اپنی مزدوری کرو۔ میں وعظ نہیں سننا چاہتا۔" عبدل خاموش ہو گیا۔ باپ بیٹے کی طبیعت اور طرزِ معاشرت میں اُسے زمین اور آسمان کا فرق دکھائی دیا۔ اُس دن سے عبدل نے اُسے کبھی کچھ نہ کہا، جس کا تعلق گوپی ناتھ کے ذاتی اخراجات سے تھا۔ باقی مزدور بھی گوپی ناتھ سے کھچے کھچے ہی رہتے۔ اگرچہ اُس نے اُنہیں تنگ نہیں کیا تھا لیکن جو عقیدت اُن کے دِل میں شنکر داس کے لئے تھی۔ اُس کا عشرِ عشیر بھی گوپی ناتھ کے لئے نہ تھا۔ اُنہیں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وُہ قیدیوں کی طرح مشقت کرنے پر مجبور تھے۔

ایک دِن گوپی ناتھ کا چھوٹا لڑکا باغیچے میں کھیل رہا تھا۔ گوپی ناتھ دفتر کے کمرے میں بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ عبدل برآمدے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ معاً اُس نے دیکھا۔ بچے کے ہاتھ میں پھولوں کے وُہ چند پودے ہیں۔ جو اُس نے ایک مہینہ پہلے بڑی مشکل سے حاصل کر کے وہاں لگائے تھے۔ اُس سے نہ رہا گیا۔ برآمدے سے نیچے اُترا اور باغیچے میں آیا۔ اُکھڑے ہوئے پودوں کو دیکھ کر اُس کا کلیجہ کٹ گیا۔ اُس

نے بے اختیار سہم کر پوچھا "یہ کیا کیا تم نے؟"

بچہ عبدل کا غصہ دیکھ کر سہم گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپا کر زور سے رونے لگا۔ رونے کی آواز سُن کر گوپی ناتھ برآمدے میں آ گیا۔ باغیچے میں بچے کو روتا دیکھ کر اُس طرف گیا۔ عبدل سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

عبدل کے چہرے پر اگرچہ غصے کی سُرخی تھی۔ لیکن بچے کے رونے پر وہ نادم ہو گیا تھا۔ اُس نے سبزے پر بکھرے ہوئے پودوں کو جمع کرتے ہوئے کہا۔ "پودے اکھاڑنے پر منع کیا تھا۔ رو پڑا ـــ"

گوپی ناتھ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بولا۔ "تم آدمی ہو یا بندر۔ یہ تمہارے باپ کا باغیچہ ہے۔ جو طیش آ گیا۔"

عبدل کو جیسے کسی نے گولی مار دی۔ اُس نے حیران ہو کر گوپی ناتھ کی طرف دیکھا۔ جو غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

عبدل نے اپنے دل کو مضبوط کر کے کہا۔ "یہ باغیچہ مَیں نے ہی لگایا ہے۔ جبھی میرے ہی دل میں خلش ہوتی ہے۔"

گوپی ناتھ کو گمان نہ تھا۔ عبدل اِس دیدہ دلیری سے زبان ہلا سکیگا۔ اُس کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے عبدل کے مُنہ پر تھپڑ مار کر کہا۔ "نکل میرے کارخانے سے! بے حیا! یہ جادو میرے سامنے نہ چل سکیگا۔"

عبدل کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ لیکن جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا کر اُس نے زہر خندہ کر کے کہا۔ "مگر نہ جاؤں گا۔ جو خدا یہاں روزی

دیتا تھا۔ وُہ باہر بھی دے گا۔"

گوپی ناتھ نے بچّے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "جا پھر ڈھونڈ ہی روزی کما۔ آج سے میرے کارخانے میں قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ دُوں گا۔"

عبدُل نے بے پروائی سے پُوچھا۔ "تو جاؤں؟"

اُسے یقین تھا۔ گوپی ناتھ اُسے جانے نہ دیگا۔ لیکن جب گوپی ناتھ نے دانت پیس کر کہا۔ "ابھی چلے جاؤ۔ ابھی اِس پھاٹک سے باہر ہو جاؤ۔" تو عبدُل کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وُہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہُوا برآمدے کی طرف چلا گیا۔ اپنی ٹوپی اُٹھائی۔ اور کارخانے سے نکل گیا۔

اُس دن بیوی نے اُسے بے وقت آتے دیکھا۔ تو حیرانی سے پُوچھا۔ "خیر ہے۔ تم آج کیسے آ گئے۔"

عبدُل خاموش رہا۔

بیوی کو اُس کی خاموشی پر شُبہ ہُوا۔ وُہ اُس کے نزدیک آگئی اور بولی "کہو تو۔ خیر ہے۔"

عبدُل کا ماتھا پسینے سے تر تھا۔ اُس نے ٹوپی اُتار کر فرش پر رکھ دی۔ اور بیوی کی طرف دیکھ کر کہا "آج پنڈت نے مجھے نوکری سے ہٹا دیا۔"

اُس کی بیوی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پھر بولی۔ "کس نے۔ بڑے پنڈت نے؟"

عبدُل نے پیشانی سے پسینہ پُونچھتے ہوئے کہا۔ "نہیں چھوٹے پنڈت نے۔"

اُس کی بیوی نے فراغت کا سانس لیا۔ کہنے لگی۔ کوئی فکر نہیں۔ لڑکے زُود رنج ہوتے ہیں۔ تمہارا ابھی تو کوئی قصُور ہوگا۔"

عبدُل نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔ "ہاں! میرا ہی قصُور ہے خُدا کی قسم!"

بیوی نے کہا۔ "میں ابھی بڑے پنڈت کے پاس جاؤں گی۔ اور اُسے سارا حال بتاؤنگی۔"

عبدُل نے چونک کر پُوچھا "کیوں جاؤ گی؟ مجھے پھر نوکر کرانے کے لئے؟"

بیوی نے کہا۔ "نوکری نہ کروگے تو کیا کروگے۔ گھر میں پڑے پڑے زنگ نہ لگیگا۔ آخر جس نے تمہاری جوانی ختم کی۔ کیا وُہ بڑھاپے میں تمہیں ٹھکرا سکے گا؟"

عبدُل نے کہا۔ "خُدا کارساز ہے۔ پنڈت بہانہ تھا۔ خدا نہ تھا۔ اُس نے میری نوکری ہی تو چھینی۔ رزق نہیں چھینا۔"

بیوی چُپ ہوگئی۔ وُہ اِس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔

شام کو عبدُل کے بیٹے پریس سے آئے۔ تو اُنہوں نے کہا۔ "ہم کل سے کارخانے میں نہ جائیں گے چاچا۔"

عبدُل نے پوچھا "کیوں؟ اِس لئے کہ پنڈت نے مجھے نکال دیا؟"

بڑے بیٹے نے کہا۔ "ہاں اِسی لئے۔ ہم عزت کی روزی کمانا چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ بے عزتی کی نہیں۔"

عبدُل نے ہنس کر کہا "ابھی نادان ہو۔ اُس کی سختی کو تم نے بہت جلد محسوس کیا۔ لیکن احسانات بُھلا دیئے۔ کیا ہوا اُس نے مجھے نکالا۔ ہم پھر بھی جیتے جی اُس کا احسان نہ اُتار سکیں گے۔"

عبدُل کو اب تک گمان تھا کہ گوپی ناتھ دو تین دن میں اپنی غلطی پر نادم ہوگا۔ اور مجھے دوبارہ بُلا بھیجے گا۔ لیکن جب کافی دِن گزر گئے اور گوپی ناتھ نے اُسے بُلا نہ بھیجا۔ تو عبدُل کو جنون سا ہوگیا۔ وُہ ہر وقت اِسی سوچ میں رہتا کہ کارخانے پر میرا کوئی حق نہ تھا۔ کیا میں نے ہی وُہ اِحاطہ نمائندگی میں جان توڑ کر صاف نہ کیا تھا۔ کیا میں نے ہی وہاں باغیچہ نہ لگایا تھا۔ کیا میری ہی کوششوں سے کارخانہ نہ چل سکا تھا؟

(۵)

کارخانے سے عبدُل کے چلے جانے کے بعد بڑی بے نظمی پیدا ہو گئی۔ کچھ مزدور عبدُل کے بعد ہی بہانہ بنا بنا کر کھسک گئے۔ جو باقی تھے۔ وُہ بھی وہاں رہنے پر رضامند نہ تھے جس زمین پر وُہ پہلے جان چھڑکتے تھے اب اُنہیں اُس سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اُنہی دِنوں شنکر داس بھی دُنیا سے اُٹھ گئے۔ کارخانہ کئی دِن بند رہا۔ عبدُل نے جب شنکر داس کی موت کی خبر سُنی۔ تو وُہ بے اختیار اُس کے گھر چلا گیا۔ گوپی ناتھ نے وہاں اُسے دیکھتے ہی دوسری طرف مُنہ پھیر لیا۔ لیکن

عبدُل کو اُس کے ساتھ کیا تھا۔ اُسے شنکر داس کی عقیدت وہاں کھینچ لائی تھی۔ اپنے دِل میں شاید اُس نے سوچا ہوگا۔ اب گوپی ناتھ میری منتیں مانے گا۔ مجھ سے معافی مانگے گا۔ لیکن جب اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ تو عبدُل زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھ سکا۔

وُہ اب بھی کبھی کبھی اندھیرا ہو جانے کے بعد کارخانے میں چلا جاتا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر جب اُسے اطمینان ہوتا کہ وہاں کوئی چوکیدار نہیں۔ تو برآمدے میں جاتا۔ بند دروازوں کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا۔ پھر باغیچے میں آتا۔ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے میوہ دار درختوں کو دیکھتا۔ کیاریوں اور پودوں کو دیکھتا۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے اُن میں اب وُہ رونق ہی نہیں۔ جو بڑے پنڈت کے دِنوں میں ہُوا کرتی تھی۔ ہر چیز میں اُسے اُداسی سی بے دِلی سی اور افسردگی سی دِکھائی دیتی۔

(۶)

ایک سال گزر گیا۔ گھر میں پڑے رہنے سے عبدُل کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا۔ آنکھوں کی بینائی بھی خراب ہو چکی تھی۔ طبیعت میں بھی چڑچڑاپن آگیا تھا۔
ایک دِن شام کو آکر بیٹے نے کہا۔ "چاچا۔ آج مشین خراب ہو گئی"
عبدُل نے حیرت سے پُوچھا۔ "کیا ہُوا؟"

بیٹے نے کہا۔ "خدا جانے کیا ہو گیا۔ چلتی ہی نہیں۔"

عبدُل نے ہنس کر کہا۔ "چلو اچھا ہُوا۔ خس کم جہاں پاک۔"

دُوسرے دِن بھی مشین ٹھیک نہ ہو سکی۔ تیسرے دِن بھی نہیں۔ گوپی ناتھ نے شہر کے بہترین کاریگر بُلائے۔ لیکن کوئی بھی مشین کو ٹھیک نہ کر سکا۔ ناچار کارخانہ عارضی طور پر بند ہو گیا۔ ایک دو مزدُور دستی مشین پر کام کرنے کے لئے رکھے گئے۔ گوپی ناتھ صُبح کارخانے میں آتا۔ میز کُرسی باغیچے میں بچھا کر مکھیاں مارتا رہتا۔ اِسی طرح کارخانہ مہینہ بھر بند رہا۔

ایک دِن پریس کا ایک پُرانا مزدُور جو عبدُل کے ساتھ وہاں کام کرتا تھا۔ عبدُل کے پاس آیا۔ بولا "چاچا اب تو خوش ہو۔ خدا نے پنڈت کو سزا دی۔ ہمیں کیا نکالا کارخانہ ہی بند ہو گیا۔"

عبدُل نے تھوڑی دیر فرش کی طرف ٹکٹکی باندھ کر سوچا۔ پھر سر اُٹھا کر کہا۔ "چلو اچھا ہُوا۔ لیکن مشین میں نقص کہاں ہو گیا۔ وُہی پُرانا جوڑ تو نہیں چھوٹا؟"

اُس مزدُور نے کہا۔ "خدا معلوم۔ میرا خیال ہے۔ تمہارے سِوا دُوسرا مشین کو ٹھیک نہ کر سکے گا۔"

عبدُل نے مسکرا کر کہا۔ "جہاں شہر کے کاریگروں نے قسمت آزمائی کی ہو، وہاں میں کس شمار میں ہوں بھائی۔"

مزدُور نے کہا۔ "تم مشین کے پُرزے پُرزے سے واقف ہو۔

تم چاہو تو ہاتھ لگاتے ہی ٹھیک کر دو گے۔"

عبدل نے سنجیدگی سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "مَیں چل پھر تو نہیں سکتا۔ کون جانے وہاں پہنچ کر گوپی ناتھ بے عزّت ہی نہ کر دے۔"

مزدور نے قریب آکر پُوچھا۔" نہیں تو تم جاتے چاچا؟"

عبدل نے گھبرا کر جلد جلد کہا۔" نہیں تو۔ لاکھ روپئے بھی مجھے دے۔ جب بھی نہ جاؤں گا۔"

مزدور نے زور سے ہنس کر اُٹھتے ہوئے کہا۔" مرحبا ہے تمہاری غیرت پر!"

اُس کے چلے جانے کے بعد عبدل کو جیسے کانٹوں پر لٹا دیا گیا۔ وُہ آہستہ سے اُٹھ کر صحن میں آگیا۔ سوچنے لگا۔" مَیں نے اُس کا نمک پندرہ برس کھایا ہے۔ اگر آج اُس کی مشین کا نقص نہ نکال دُوں۔ تو کل خدا کے آگے کیا جواب دُوں گا۔"

لیکن پھر یہ سوچ کر مڑنے لگا کہ جب اُس نے میرا حق نہ پہچانا تو مَیں کیوں اُس کا غم کھاؤں۔ مشین خراب ہو گئی تو میری بَلا سے۔

لیکن اِس سے بھی اُس کی تسلّی نہ ہوئی۔ وُہ پھر صحن کے دروازے کے نزدیک چلا گیا۔ بیوی نے اُوپر سے دیکھ کر پُوچھا۔" کہاں جاؤ گے۔ کہیں گر جاؤ گے تو ـــــ"

عبدل نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔" کہیں نہیں جاتا۔ صحن میں

ذرا جی بھر لیتا ہوں۔"

بیوی اندر چلی گئی۔ تو عبدل آہستہ سے دروازہ کھول کر نکلا۔ اور پریس کی طرف چلا گیا۔

پھاٹک پر پہنچ کر اُس نے دیکھا۔ گوپی ناتھ دھوپ میں کرسی پر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر سر کو سہارا کر بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ عبدل پہلے جھجکا۔ پھر بے اختیار اُس کے نزدیک پہنچ کر رُک گیا اور آہستہ سے بولا "سلام"

گوپی ناتھ چونک پڑا۔ سر کو اوپر اُٹھا کر اُس نے بے دلی سے کہا۔ "سلام۔ ابھی جیتے ہو عبدل؟"

عبدل نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی مرا نہیں۔ خدا بے انصاف نہیں۔"

گوپی ناتھ نے ظاہرا طور پر مسکرا کر کہا۔ "اچھی بات ہے لیکن آج کیسے اِس طرف آ نکلے؟"

عبدل نے کہا۔ "میں نے سُنا مشین خراب ہو گئی ہے۔ دل میں سوچا میں بھی ایک نظر دیکھ آؤں۔ تو کیا ہرج ہے۔"

گوپی ناتھ نے طنزاً کہا۔ "دیکھ لو۔ ہرج تو کوئی نہیں۔ ہاں اِس سے تمہارے دل کی بھڑاس نکلے تو نکلے۔"

عبدل غور سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس نے تھوڑی دیر بعد مسکرا کر کہا۔ "بھڑاس نکالنے نہیں آیا ہوں۔ مشین کو درست کرنے آیا ہوں۔"

گوپی ناتھ نے حیرت سے پُوچھا۔ "تم۔ تم ٹھیک کرو گے؟"
پھر زور سے ہنس پڑا۔ کرسی سے اُٹھا۔ اور عبدُل کو ہاتھ سے پکڑ کر کارخانے میں لے گیا۔ اِس لئے نہیں کہ مشین درست ہو جائے بلکہ اِس لئے کہ اُسے شرمندہ کرے۔
عبدُل نے سرسری طور پر مشین کو دیکھا۔ اور گوپی ناتھ سے کہا۔
"اب تو بصارت بھی نہیں رہی۔"
گوپی ناتھ زور سے ہنس دیا۔ بولا۔ "ہار گئے رستم صاحب!"
عبدُل نے کہا۔ "ذرا ٹھہریئے۔ آپ اپنی جگہ بیٹھیں۔ تو میں اطمینان سے کام کر سکوں گا۔"
گوپی ناتھ ہنستا ہنستا اور سگریٹ کو سُلگاتا ہُوا برآمدے میں چلا گیا۔
عبدُل پُرزوں کو کھولنے اور جوڑنے لگا۔
جب کافی دیر ہو چکی۔ اور عبدُل باہر نہ نکلا۔ تو گوپی ناتھ دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "آؤ اب۔ دِن ڈھل چکا ہے۔"
عبدُل نے مُسکرا کر کہا۔ "دِن بھی ڈھل چکا۔ اور مشین بھی ٹھیک ہو گئی۔"
گوپی ناتھ کو خیال ہُوا عبدُل اُس سے مخول کر رہا ہے۔
عبدُل نے پھر کہا۔ "ذرا سُوِچ دبایئے۔"
گوپی ناتھ حیرت کا مجسمہ بنا اُسے دیکھنے لگا۔ عبدُل نے پھر کہا۔

"دبائیے سُوِچ ۔"

گوپی ناتھ نے پوچھا۔ "سچ کہتے ہو۔ ہو گئی مشین ٹھیک ؟"

عبدُل نے کہا۔ "خدا کو منظور ہو گا۔ تو ٹھیک ہو گئی ہو گی ۔"

گوپی ناتھ نے فرطِ مسرت میں سُوِچ دبایا۔ مشین چھن چھن کرتی ہوئی چل پڑی ۔

گوپی ناتھ ششدر رہ گیا۔ اُس نے کہا۔ "عبدُل ۔ تم کتنے بڑے کاریگر ہو۔"

عبدُل نے کہا۔ "کاریگر نہیں ہوں ۔ بندہ ہوں بے حیا بندہ۔"

گوپی ناتھ کو باغیچے کا واقعہ یاد آگیا۔ اُس نے زمین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "عبدُل ۔ تم مجھے معاف نہ کرو گے ؟"

عبدُل نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مُسکراتے ہوئے کہا۔ "معاف نہ کیا ہوتا۔ تو آج یہاں کیسے آتا ۔ یہ سچ ہے کہ تم نے میرا حق چھینا ۔ لیکن میں اپنا فرض نہ بھول سکا ۔"
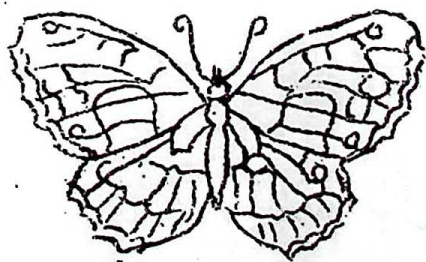
سہارا

خزاں کے موسم میں جب کبھی مطلع ابر آلود ہو جاتا ہے۔ تو باغوں پر بھی ایک کیفیت سی چھا جاتی ہے۔ ہلکی اور میٹھی دھوپ میں پھیلا ہوا جوش کہیں کہیں یکلخت ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اور کہیں کہیں کسی کے دل میں زیادہ اُبھر آتا ہے۔ آج بھی آسمان ابر آلود تھا۔ لیکن مایوس فضا اور مکدّر ماحول کو دیکھتے ہوئے بھی محکمۂ آثار قدیمہ کے تواریخی باغ میں کچھ نوجوان عورتیں مورنیوں کی طرح مسرّت میں جھوم رہی تھیں۔ وہ سڑک کے کناروں سے اور باغ میں چنار کے جھڑے ہوئے زرد اور لال لال پتے بڑے انہماک سے جمع کر رہی تھیں۔ کبھی سوکھے ہوئے سبزے پر لوٹتی تھیں اور کبھی زور سے قہقہہ مارتی تھیں۔ اس وقت تک جب کہ پاس کی چھاؤنی سے تین بجے کے بگل ابھی ابھی بج کر خاموش ہو گئے تھے اُنہوں نے باغ کے وسط میں پتوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر جمع کیا

ہُوا تھا۔ ہنگامی مسرّت کے ساتھ ساتھ اُن کی نگاہوں میں خوف بھی جھانک رہا تھا۔ کہیں محکمہ آثار قدیمہ کا کوئی ملازم اُنہیں پتّے جمع کرنے سے نہ روکے۔ یا چھاؤنی کا کوئی سپاہی سڑک کے کنارے جھڑے ہوئے پتّے جمع کرنے پر بُرا بھلا نہ کہے۔ وُہ ہر سال اِسی طرح مسرّت اور خوف کے مِلے جُلے جذبات کے زیرِ اثر پتّے جمع کیا کرتی تھیں۔ اور اُنہیں ٹوکریوں میں بھر کر خوشی خوشی گھر لے جاتی تھیں۔ اِس مشقّت سے جو محض عارضی اور کسی حد تک تفریحی بھی تھی۔ اُن کے مالک زمستان کے ایک ضروری مصرف سے بے نیاز ہو جاتے تھے۔

اور آج بادل چھائے ہوئے تھے۔ جانے کس وقت آسمان سے پانی برسنا شروع ہو جائے اور محسن درختوں سے جھڑی ہوئی دولت بہہ کر ضائع ہو جائے۔ اور پھر اِس موسم کے بعد زمستان —— کڑاکے کی سردی —— برف —— سبھی کچھ اچپ چیرن کے نیچے شعلوں سے دہکتی ہوئی کانگڑی ہر کشمیری کی رُوح بن جاتی ہے۔

باغ کے کونے میں ایک نوجوان دایہ دستی گاڑی میں بچے کو سُلا کر سُوکھی گھاس پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے بال بے ترتیبی میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ذہنی پریشانیوں کے سبب انتشار سا پھیلا ہُوا تھا۔ باغ میں وُہ روزانہ آتی تھی۔ لیکن اِس سے قبل وہ کبھی اس طرح من کو مار کر نہ بیٹھی تھی۔ اور نہ شاید اُس سے اِس طرح بیٹھا جاتا تھا۔ کچھ نہیں تو سُوکھے پودوں ہی سے کھیلتی تھی۔ بچّے

۱؎ کشمیری پیرہن۔

گنگنا ہی لیتی تھی۔ کسی کم سن سے بات چیت ہی کر لیتی تھی لیکن آج ــــ آج وہ خاموش تھی اور پریشان سی۔ اور باغ میں کچھ نوجوان عورتیں مور نیوں کی طرح مسرت میں جھوم رہی تھیں۔ وہ پولو گراؤنڈ کے قریب، کلب روڈ پر، کمپنی باغ میں لاتعداد کشمیری عورتوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو تنکے، درختوں کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں اور سڑک پر بکھری ہوئی پتیاں جمع کرتے دیکھتی تھی۔ اور کسی حد تک اُن سے مانوس بھی ہو چکی تھی۔ اگرچہ اُن کی معاشی زندگی سے اُسے نفرت سی تھی۔ اور اپنے دل میں کبھی کبھی سوچتی تھی " اتنی میلی کچیلی عورتیں زندہ کیونکر رہتی ہیں؟" لیکن آج باغ میں پتے جمع کرنے والی عورتوں کو دیکھ کر اُس کی نفرت نمایاں نہ ہوئی اور نہ اُس کے دل نے سوال کیا۔ " اتنی میلی کچیلی عورتیں زندہ کیوں کر رہتی ہیں۔"

اُس کی پُر ملال اور منتشر نگاہوں نے اُنہیں دیکھا۔ صرف دیکھا اور کانوں نے کبھی کبھی اُن کے قہقہے کی آواز سُنی!

"اُف" ــــ اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ لیکن جلد ہی اُس نے سُنا "خدا بچائے۔ ہم دواؤں پر بچوں کو نہیں پالتیں۔ جتنا دُودھ چھاتیوں سے نکلے۔ اُنہیں پلاتی ہیں یا کلچہ۔ ستو۔ شیریں چائے۔ بھتہ۔ تمہارا دل کی طرح، نہیں۔"

"اور مکھن بھی نہیں؟" نصیرن نے حیران ہو کر پوچھا۔
ایک عورت نے ہنس کر کہا۔ "یہاں یہ چیزیں بیماروں کو دیتے ہیں۔

بچّوں کو نہیں ۔"

تینوں عورتیں بتوں کے ڈھیر کی طرف جانے لگیں اور نصیرن بھی گاڑی کو آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی اُسی طرف نکل گئی ۔ چلتے چلتے ایک عورت نے پوچھا ۔" تمہاری میم کے کتنے بچّے ہیں ؟"

نصیرن نے جو کسی اور سوچ میں ڈوب گئی تھی ۔ چونک کر کہا ۔" صرف یہی ایک ! یہی میرا ننھا — بابا ۔"

دوسری عورت نے جلد جلد سوال کیا ۔" کتنے برس ہوئے اِسے شادی کئے ہوئے ؟"

گاڑی آہستہ آہستہ چلنے کی حرکت سے بچّہ جاگ اُٹھا تھا ۔ نصیرن نے گاڑی روک کر اُس کے بدن سے اُونی رُومال اُٹھا لیا ۔ اور مسکرا کر اُس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ۔" سات برس" تینوں عورتوں نے اپنی اُنگلیاں دانتوں تلے دبائیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں ۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں استعجاب تیرنے لگا ۔ سات برس میں ایک بچّہ ! اُن کی شادی کو صرف پانچ برس گُزرے ہوئے ہوں گے اور اُن کے گھروں میں تین تین بچّے کھیل رہے تھے اور میم کے ہاں سات برس میں صرف ایک بچّہ !

" دراصل یہ لوگ —" اُدھیڑ سیانی عورت نے سنجیدگی سے اور دو عورتوں کو کچھ کہنا چاہا تھا لیکن کہا نہیں ۔

نصیرن بچّے کو گود میں اُٹھا کر خُوب ہنس دی ۔ کل دوپہر سے اِس

وقت تک اُس نے شاید پہلی بار کھُلے دِل سے ہنسا اور وُہ بھی تین چار بچّوں کی ماں کی فلسفیانہ بات سُن کر! تینوں عورتیں بچّے کو غور سے دیکھنے لگیں، جو میم کی سات برس کی شادی کا نچوڑ تھا۔

"کتنا موٹا بچّہ ہے"، ایک عورت نے جاتے جاتے دُوسری سے کہا۔ "تین برس سے کیا کم عُمر ہو گی؟"

نصیرن نے گاڑی میں بچّے کو لٹا کر گاڑی پھاٹک کی طرف موڑ لی۔ اور واپس جانے لگی۔ اُسے میلی کچیلی کشمیری عورتوں سے نفرت کی جگہ اُنس سا ہونے لگا۔ جو کسی حال میں اُس سے عُمر میں زیادہ نہ تھیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ محبّت کی بے اعتدالیوں اور پست حالی کے سبب اُن کی زندگی میں ساز کے شکستہ تاروں کی طرح اُلجھاو پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس میں دلکش نغمے کی آواز گونج رہی تھی۔ جس کی لَے نے اُنہیں بالکل مطمئن بے پروا اور قانع بنا رکھا تھا۔ اِس کی وجہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ وُہ اپنے مردوں کے پہلوؤں میں لمحے گزار رہی تھیں۔ اُن کے ڈھیلے ڈھیلے بدن کے نیچے مضبوط اور تنومند سہارے آ چکے تھے۔

وُہ اِسی خیال میں جا رہی تھی۔ جتنے کہ پُل کے پار کچّی اینٹوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں کی طرف تینوں عورتیں چلی گئیں۔ اُسی طرح بے پروائی میں مسکراتی مُسکراتی۔ ایک دوسری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ قہقہے مارتی ہوئی۔

نصیرن نے تھوڑی دیر کے لئے سڑک کے وسط میں اپنے قدم روک لیے اور اُن عورتوں کو جو ابھی ابھی اُس سے باتیں کرکے چلی گئی تھیں، دیکھنے لگی۔ نوجوان عورتوں کی مسرّت کے سایے تلے اُس پر دیوانگی سی چھا گئی۔ ایک عجیب کیفیت ——! اُسے بچّے تک کا خیال نہ رہا جو نیلی نیلی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

کاش —— کاش! میرا بھی گھر ہوتا ایسا ہی۔ کچّی اینٹوں کا بنا ہُوا۔ بید کے درختوں میں گھرا ہُوا جہاں ہر وقت، ہر طرف محبّت ہی محبّت چھائی رہتی۔ جس سے افلاس کی گرانباری محسوس نہ ہوتی۔ جہاں پھٹے ہوئے پاؤں۔ لٹکتی ہوئی چھاتیوں اور پیوند کیے ہوئے کپڑوں کی تنگ ناموس نیلی نیلی آنکھوں میں کبھی بھی نراشا بن کر نہ جھلکتی —— کاش —— کاش میرا بھی ایسا ہی گھر ہوتا!

وُہ اِسی سوچ میں آگے بڑھنے لگی۔ اُس کی نگاہوں کو اب سہارے کی جستجو تھی۔ جو اُس کے شباب کو اُٹھائے اُسے اپنے اُوپر لئے پھرتا۔ راستے میں آنے جانے والے کتنے ہی فوجی سپاہیوں اور راہرؤں کو اُس نے دیکھا۔ اُن میں کچھ نوجوان تھے اور کچھ جوانی سے پرے پہنچے ہوئے —— لیکن —— نہیں —— نہیں۔ نصیرن کی آگ کو آگ کی ضرورت تھی۔ اُس کے گرم لہو کو گرم لہو کی ضرورت تھی اور وُہ راہ چلتے جوان —— وُہ صرف ہنگامی اور غیر ارادی جذبات سے متاثر ہو کر اُسے دیکھتے تھے۔ حقیقی آگ کی تپش محسوس کرتے ہوئے نہیں اور

ایسی آگ سے کھیلنا ــــــ وہ نہیں چاہتی تھی ــــــ وہ اسی خیال میں پھاٹک میں داخل ہوئی۔

نوبت خان رسوئی خانے کے باہر شکستہ بنچ پر پیاز چھیل رہا تھا۔ نصیرن کو دیکھتے ہی اُس کی بھویں تن گئیں۔ نصیرن نے بچے کو مالکن کے حوالے کر دیا۔ اور اپنے کمرے میں جانے کے عوض رسوئی خانے کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ سے بولی۔ "شوربہ ہے ؟"

نوبت خان نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ نصیرن سچ مچ شوربہ مانگ رہی ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ نصیرن کا ظاہری وجود شوربہ ایسی مقوی غذا مانگ رہا ہے۔ لیکن باطنی وجود' اصلی نصیرن کی نگاہیں اُس سے کچھ اور طلب کر رہی تھیں۔ جسے وہ زبان پہ نہ لا سکتی تھی۔ اپنے ہونٹ زور سے بند کئے اور دِل ہی دل میں نادم بھی ہوئی ــــــ وہ اگرچہ زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ یا کم از کم ایسی نہ تھی، جسے حسن کا کوئی معیار ــــــ ادنیٰ ہی سہی قرار دیا جائے لیکن اُس کے نقش و نگار میں غیر معمولی کشش سی تھی۔ وہ کشش جو بعض اوقات سرِ راہ ترتیب میں آنے جانے والے فوجی سپاہیوں کے دِلوں میں وقتی جذبات اُبھارنے میں کامیاب ہوتی تھی ــــــ یا اُس کے خانساماں کو اُس کی طرف بسا اوقات متوجہ کرتی تھی۔ لیکن اِس کشش سے بھی وہ واقف نہ تھی۔ وہ صرف اِتنا جانتی تھی کہ وہ

ایک فرنگی عورت کی نوکرانی ہے۔ جس کا کام اُس کے بچّے کو تازہ ہوا کھلانا ہے۔ صابن کی مرمریں جھاگ سے نہلانا ہے۔ وقت وقت پر کلم اور گلیکسو کھلانا ہے۔ مکھّن اور شوربہ پلانا ہے۔ اُسے گاڑی میں لٹا کر کلب روڈ۔ ہوٹل روڈ اور چھاؤنی کی طرف گھومنا ہے اور شام کے وقت بچّے کو سُلا کر اپنے کمرے میں . . . . . ."

کبھی کبھی جب وُہ شدّت احساس سے مجبُور ہوتی۔ دل کے پوشیدہ گوشے میں اپنی اور مالکن کی زندگی کا موازنہ کرتی۔ لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا اُس وقت آندھی کی طرح اُس کے جذبات میں طوفان اُٹھتا۔ اور گرد و غبار کی طرح وُہ اِسی آندھی میں بہت دُور جا لگتی۔ حتےٰ کہ طوفان تھم جاتا اور اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ ایسے وقتوں میں صرف اُس کا دماغ ہی زبان اور آنکھوں کا کام کرتا۔ اور اُس کا ظاہری بدن اس موازنے کے ہنگامے سے ناآشنا رہتا۔ "آخر مجھ میں اور مالکن میں کتنا فرق ہے۔ وُہ انار کے دانے کی طرح لال اور میں ــــ میں کشمیرن! لیکن دونوں عورتیں ہی تو ہیں۔ اور یہ پتے جمع کرنے والی کشمیری عورتیں! یہ بھی تو ہماری ہی سطح پر کھڑی ہیں۔ اگر سبھی عورتیں روزانہ مکھّن۔ شوربہ اور برانڈی پینے کی عادی ہوں۔ تو سب کی ٹانگیں سڈول۔ چھاتیاں بنتل کے گیند کی طرح سخت اور بال ریشم کی طرح نرم و نازک ہوں گے اور رنگ ٹماٹر سے زیادہ سُرخ۔ شعلے سے زیادہ خوبصورت اور جاذبِ نظر! لیکن ہم ہیں دال اور چاول کھانے کے

عادی جس سے گردن کا گوشت بھی لٹک جاتا ہے۔"

اُس نے ایک دن خانساماں سے پوچھا۔ "ہم تم شوربہ کیوں نہیں پیتے خان؟" خانساماں اُس وقت نصیرن کے فلسفے کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا۔ غیر ارادی طور پر بولا۔ "شوق سے، شوق سے!" اور پھر زور سے مسکرایا۔

نصیرن کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اب شوربہ پیئے گی۔ کیک کھائے گی۔ اور اگر جی چاہے تو برانڈی بھی ——— پھر مالکن اور اُس میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

لیکن کل عجیب بات ہوئی۔ وہ شوربہ پی چکی تو خانساماں نے اپنا مضبوط ہاتھ اُس کے داہنے گال پر پھیرا۔ اور آہستہ سے ہنس دیا۔

نصیرن کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ چہرے پر ہلدی سی پھیل گئی۔ اُس نے حیرت بھری نظروں سے خانساماں کی طرف دیکھا۔ جس کے ہونٹ مسکراہٹ کے بعد اب تک تھرتھرا رہے تھے۔

خانساماں نے دوبارہ اپنا ہاتھ اُس کے گال پر پھیرنا چاہا۔ تو نصیرن مضبوطی سے بولی ——— "کمینے ——— پاپی ———"

نوبت خان کئی انگریزوں کے پاس رہ چکا تھا۔ اُس نے نصیرن ایسی کئی نوکرانیاں دیکھی اور آزمائی تھیں۔

مسکراتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ "خفا ہوگئیں؟"

نصیرن نے شوربے کا خالی گلاس دُور پھینکتے ہُوئے کہا۔ ”تم مجھے اِسی لئے شوربہ پلاتے رہے کہ مَیں تمہاری گالی برداشت کر سکوں ——“

نوبت خان کو نصیرن کا غصّہ بالکل بے حقیقت دکھائی دیا۔ وُہ خود بھی نوجوان تھا۔ لیکن جہاں دیدہ!

گالی کا لفظ سُن کر وُہ زور سے ہنس پڑا۔ بولا۔ ”خُدا کی قسم! تم مزے کی لڑکی ہو نصیرن! معمولی بات پر بہت زیادہ چڑ گئی —— ہاہاہا —— گالی؟“

نصیرن کچھ بھی نہ بول سکی۔ لفظوں کی جگہ اُس کے مُنہ میں دھواں سا جمع ہو گیا اور آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ آنسو بھی پھُوٹ پڑے۔

نوبت خان اُس کے قریب آکر سنجیدگی سے بولا۔ ”تم لاکھ بُرا مناؤ۔ لیکن ایک دِن تمہیں کسی کی گالی برداشت کرنی پڑے گی۔ تمہارا شباب، تمہارے خدوخال، تمہاری آنکھیں خود گالی کے لئے آوارہ ہونگی اور ۔ ۔ ۔ ۔ آج۔“

نصیرن نے نوبت خان کی بات خاموشی سے سُنی۔ لیکن غصّے میں اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اُسے زندگی میں پہلی بار محسُوس ہُوا کہ وُہ مالکن کے زیرِ سایہ رہتے ہوئے بھی کس قدر کمزور اور بے بس ہے۔ نوبت خان کے چہرے سے سنجیدگی غائب ہو گئی اور مسکراہٹ

پھیل گئی۔

نصیرن چپکے سے اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ اُسے محسوس ہُوا جیسے اُس کے دِل پر، اُس کے گھٹنوں پر، اُس کے پپوٹوں پر کسی نے من من بھر کے پتھر، سرد اور بے مہر رکھ دئے ہوں۔ اُسے ساری کوٹھی بجھی ہوئی بھٹی سی دکھائی دی۔ جہاں اِس کے لئے کہیں بھی شفقت یا ہمدردی کی گرمی نہ تھی۔

صحن میں بھنگی کوڑے کرکٹ کا ٹوکرا لئے باہر جا رہا تھا نصیرن کو دیکھتے ہی اس کے قدم رُک گئے۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ پھیلا کر اُس نے کہا۔ "سلام ہے بُوا۔"

نصیرن نے بادِل ناخواستہ اُس کی طرف دیکھا اور بھنگی نے پاس آکر کہا۔ "اپنے قدموں کی خیرات نہ ملے گی اب ——"

بھنگی کئی دِن سے اپنی جوان بیٹی کے لئے نصیرن سے پُرانی دھوتی مانگ رہا تھا۔ آج نصیرن کو رسوئی خانے سے نکلتے دیکھ کر اُسے اپنی بیٹی یاد آئی۔ جس کی شلوار رانوں پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ اور خوفِ ندامت سے وُہ باہر نہ نکل سکتی تھی۔

نصیرن کا جواب نہ پاکر بھنگی نے عاجزی سے کہا۔ "اُس کی ٹانگیں، رانیں ننگی ہو رہی ہیں۔ وُہ باہر نکل ہی نہیں سکتی —— کہیں کوئی لفنگا اُسے گالی نہ دے —— اسی لئے ——" نصیرن نے بھنگی کی بیٹی نہ دیکھی تھی۔ اور آج تک ہر روز بھنگی صرف قدموں کی خیرات مانگ

رہا تھا۔ لیکن اب گالی کا لفظ سُن کر اُس کے دِل میں بھنگی کی بیٹی کے لئے ہمدردی سی پیدا ہو گئی۔

"وہ ننگی ہو جائے گی۔ اور پھر گالی —" اُس نے دِل میں سوچا۔ "کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہوئے بھی جب خانساماں مجھے گالی دے سکا تو اُسے کون گالی نہ دے سکے گا۔" وہ جلد جلد اپنے کمرے میں چلی گئی اور کھونٹی پر لٹکتی ہوئی دھوتی جو اُس نے گذشتہ مہینے ہی سے استعمال کی تھی، بھنگی کی طرف پھینک دی۔

بھنگی اُس کی جان اور اُس کے بچوں کو دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ حالانکہ نسیرن کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اسے شک ہوا۔ بھنگی نے جان بوجھ کر اُسے گالی نہ دی ہو۔ وہ دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ لیکن بھنگی پھاٹک سے باہر نکل چکا تھا۔ نصیرن کی خیرات نے اس کے قدموں میں سُبک رفتاری پیدا کر دی تھی۔ اور وہ اپنی بیٹی کو کسی لفنگے کی گالی سے بچانے کے لئے قدم پر قدم اُٹھاتا جا رہا تھا۔

وہ کمرے میں بے تاب سی ہو اُٹھی۔ خانساماں کی گالی اُس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اس کی خطرناک پیشین گوئی بھی "نصیرن ایک دن تمہیں کسی کی گالی برداشت کرنی پڑے گی۔ تمہارا شباب تمہارے خدوخال، تمہاری آنکھیں خود گالی کے لئے آوارہ ہونگی" اس کے جذبات میں جوار بھاٹا آ گیا تھا۔ اگر آج صاحب موجود ہوتا تو وہ اُسے صاف صاف کہہ دیتی کہ خانساماں نے اس کی شرم وحیا پر

حملہ کیا۔ لیکن وُہ لاحاصل ہو گیا ہُوا تھا۔ اَور میم صاحبہ سے شکایت کرنے کی اُس میں ہمّت نہ تھی۔ وُہ معمولی باتوں پر اُسے جھاڑ دیتی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُسے نصیرن سے پیار بھی تھا۔

اُس نے سر درد کا بہانہ کر کے بچّے کو سیر کے لئے نہ نکالا۔ اپنی کوٹھڑی میں رضائی کے نیچے سر چھپا کر لیٹ گئی۔

ایک بار مالکن خود اُس کے کمرے کے دروازے پر آگئی۔ نصیرن کو رضائی کے نیچے لیٹی دیکھ کر بولی "نصیرن!"

نصیرن اُٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولی "حضور آج سر میں درد ہے۔ بہُت درد ہے۔ آج باہر نہ جا سکوں گی ــــ اَور ــــ"

میم کو اس کے بکھرے ہوئے بال، پسینے سے شرابور پیشانی اَور ڈھیلا ڈھیلا بدن دیکھ کر اُس کے سر درد کا یقین ہو گیا۔ بولی "ڈاکٹر بلاؤں؟"

نصیرن نے گھبرا کر کہا "نہیں حضور! صُبح تک ٹھیک ہو جاؤنگی۔"

میم نے اپنی نیلی آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا "اوہ ــــ ڈاکٹر نہیں۔ اچھّی بات ہے روٹی مت کھاؤ ــــ شوربہ پیو ــــ"

شوربے کا نام سُن کر نصیرن کی ملول آنکھوں میں دوبارہ خوف سا چھا گیا۔ اِسی چیز نے خانساماں میں اُسے گالی دینے کی ہمّت پیدا کی تھی۔ اُس نے جلد جلد کہا۔ "شوربہ نہیں حضور! فاسٹ کروں گی۔"

میم نے جاتے جاتے کہا "اچھّی بات ہے لیکن سب بے بی سے چھُونا

منٹ! اچھا۔"

مالکن کے منع کرنے نے نصیرن کے دل میں ہلکی سی خراش پیدا کی۔ وہ "بابا" پہ جان دیتی تھی۔ لیکن سرورد میں اُسے چھونے کی ممانعت تھی۔ اِس لئے کہ اُس کی خدمات مستعار اور اُس کی محبّت غیر ارادی تھی!

لیکن نصیرن اُس سے غیر ارادی محبّت نہ کرتی تھی۔ اُسے اگرچہ معلوم نہ تھا کہ محبّت کی اِنتہا کیسی ہوتی ہے اور آغاز کیسا۔ لیکن جس طریق پہ وہ بچّے کو چاہتی تھی۔ کیا وُہ محبّت نہ تھی ——— وُہ ہلکے سُروں میں گا گا کر اُسے نہلاتی تھی۔ مُسکرا مُسکرا کر اُس کے مکھّن جیسے ملائم بدن پر پوڈر ملتی تھی۔ صبح اور شام اُسے سیر کے لئے گاڑی میں لٹا کر لے جاتی تھی۔ وقت وقت پر اُسے کلم اور گلیکسو کھلاتی تھی۔ کیا یہ محبّت نہیں؟

اور صبح سے شام تک جب اُس نے اپنے 'بابا' کو نہیں دیکھا تو وُہ بیاکل ہو گئی۔ وُہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکلی۔ مالکن کے کمرے کے باہر ہیٹ سٹینڈ پہ فوجی ٹوپی آویزاں تھی۔ ہُو بہُو ایسی ہی ٹوپی اُس کا صاحب بھی پہنتا تھا۔ لیکن وہ تو لام پر گیا ہُوا تھا۔ اور ٹوپی پر ویسے ہی بیتل کے بلّے لگے ہوئے تھے۔ جو دہلیز کے بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹوپی اُتاری۔ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر وہیں رکھ دی۔

اندر کمرے میں مکمّل سکوت تھا حتیٰ کہ دروازے پر لٹکنے ہوئے ریشمی پردے میں بھی کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ اُدھر پرے رسوئی خانے میں

شاید نوبت خان شوربہ پکا رہا تھا۔ نصیبن نے آہستہ سے پردہ ہٹایا اور ایک قدم اندر داخل ہوئی۔ معاً دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر جلد جلد باہر نکلی۔ اور دہلیز کی سیڑھیوں کو پھاندتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی۔ اُس کا سانس پھول چکا تھا۔ آنکھیں حیرانی کے سبب بہت بڑی ہو گئی تھیں۔ وہ بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی رضائی پر بیٹھ گئی۔ آج اُس کی آنکھوں نے عورت کی صحیح تصویر دیکھی تھی۔

اُسے اب نوبت خان کی گالی کچھ کچھ ہلکی دکھائی دینے لگی۔ اُسے محسوس ہونے لگا۔ عورت دُنیا میں صرف گالی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ خواہ وُہ مالکن کی حیثیت میں ہو یا نوکرانی کی حیثیت میں۔ اِسی لئے عورت محتاج بھی ہے۔ اور کبھی کبھی آوارہ بھی ہو جاتی ہے۔"

رات کو اُس نے کچھ بھی نہ کھایا۔ اُسے اپنا "بابا" تک یاد نہ رہا۔ آج کا دن اُس کی زندگی میں اہم ترین دِن تھا۔ اور آج کی رات طویل ترین! انہی چند گھنٹوں نے اُسے بہت نازک بات سمجھا دی تھی۔ جو آج سے بہت پہلے شوربہ پی پی کر بھی وُہ نہ سمجھ سکی تھی۔

"شوربہ بھی کتنی مقوّی غذا ہے۔" اُس نے سوچا۔ "لیکن ہم ہندوستانی لڑکیوں کے لئے نہیں۔ ہمارے لئے دال اور چاول ہی اچھے ہیں۔ جسے کھا کر کوئی گالی نہیں دے سکتا۔ جس سے بدن سڈول نہیں ہوتا۔ جس سے اعضا میں سختی اور جاذبیت نہیں پیدا ہوتی ــــــ"

وُہ انہی خیالات کی ندی میں بہتی گئی۔ اور رات کا لمحہ لمحہ بغیر کسی

سرسراہٹ کے اُس کے کمرے کے باہر گزرتا گیا۔

(۲)

اُس وقت بھی جب کہ مطلع ابر آلود تھا اور کشمیری عورتیں جھڑتے ہوئے پتے جمع کرنے میں منہمک تھیں۔ اُس کے ذہن میں کل کا واقعہ پھر رہا تھا۔ اُس نے آج صبح نوبت خان کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔ اور نہ وہ اُس کی طرف دیکھنا چاہتی تھی۔ وُہ کبھی کبھی بے ساختہ طور پر باغ کی دُوسری طرف پتوں پر جھکی ہوئی عورتوں کو دیکھتی تھی۔ کاش! وُہ بھی اِن کی طرح آزاد ہوتی۔ اُس کا بھی گھر بار ہوتا۔ اپنا دیس ہوتا۔ وُہ بھی خزاں کے موسم میں ٹوکری سر پر اُٹھائے باغوں میں پھرا کرتی۔ اور اپنے کوارٹر کی بلندی کے برابر پتوں کا ڈھیر جمع کر کے کبوتری کی طرح اُس پر لوٹتی۔ لیکن وُہ بابا کی دایہ تھی۔ اور بابا گاڑی میں اُونی رُومال کے نیچے سو گیا تھا۔ وُہ اس وقت واپس بھی نہ جا سکتی تھی۔ قدرت نے جہاں اُسے اپنے وطن سے دُور پھینکا تھا۔ وہاں اُس پر بھاری ظلم بھی کیا تھا۔ حُسن کو حُسن کا تابع بنا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ حسن کے اصطلاحی معنی سے غیر واقف تھی۔ اُس پر یہی سوچتے سوچتے کیفیت سی طاری ہو گئی۔ وُہ اب بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ اُسے انگور کی بیل کی طرح سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس پر وُہ اپنے بدن کا، اپنی اُمنگوں کا سارا بوجھ ڈال کر لیا لیٹ جائے۔ اور زندگی کے مختلف دوروں سے گزرتے

ہوئے اُس سے مطلق کوئی کوفت محسوس نہ ہو۔ لیکن سری نگر پردیس تھا۔ اور سہارا ابھی اُس کی نظروں سے اوجھل ——— ابھی اُس کے تصوّر سے بھی باہر!

اور سامنے کشمیری عورتیں پتے جمع کرتی کرتی اُس کے نزدیک پہنچ گئی تھیں۔ وہ بات بات پر مسکرا رہی تھیں۔ دوپہر سے کام کرتے کرتے وہ تھک نہ گئی تھیں۔ پرانے کپڑوں میں بجھا ہوا شباب اور اُس پر گھر بار کی بے پناہ محبت نے اُنہیں کس قدر مطمئن بنا رکھا تھا۔ پھٹے ہوئے پاؤں اور پیٹ تک لٹکتی ہوئی چھاتیاں اگرچہ اُن کی کم خوراکی اور پست مالی کا ثبوت تھیں۔ لیکن اُن کی نگاہوں میں شعریت کا خمار اور قناعت کی جھلک تھی۔ اور اُن کے برعکس نصیرن کا بدن جو شوربہ پی پی کر گٹھا ہوا تھا۔ چست اعضا، دلکش خدوخال، صاف اور ستھری پوشاک۔ لیکن پھر بھی غیر مطمئن ——— سکون سے نابلد!

"اچھی ہو؟" ایک عورت نے اپنا چھاٹو زمین پر پھینکتے ہوئے نصیرن سے پوچھا۔

نصیرن کا خیالی خواب ٹوٹ گیا۔ وہ چونک سی اُٹھی۔ بولی۔ "شکر ہے۔"

دوسری عورت اُس کے پاس آکر بیٹھ گئی ——— "تم آج اُداس کیوں ہو؟" اُس نے مسکرا کر نصیرن سے پوچھا۔ "مالک تو یاد نہیں آگیا ہے؟"

نصیرن چنار کے ایک پتے کو مروڑنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ "کچھ بھی نہیں۔"

تیسری عورت عمر میں اِن دونوں سے ذرا بڑی تھی۔ وُہ ہٹ کر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گئی۔

"تمہارا مرد کیا ہے؟" پہلی عورت نے دوبارہ پُوچھا— نصیرن یہ سوال سُننا ہی نہ چاہتی تھی۔ اِسی سوال نے اُسے کل دوپہر سے ذہنی تکلیف دی تھی۔ اَور اب تک یہی بات اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ وُہ اِس سوال کو ٹالنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس سے کچھ بن نہ پڑا۔ مجبُور ہو کر بولی۔ "مَیں ابھی کنواری ہُوں۔"

دونوں نوجوان عورتوں نے ایک دوسری کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔ اُن کے خیال میں نصیرن کی عمر چار پانچ بچّوں کی ماں بننے کی عمر تھی۔

اُن میں سے ایک عورت نے نہایت رازدارانہ طریقہ سے پُوچھا۔ "تمہارے دِل میں کبھی بھی شادی کی خواہش نہیں ہوئی——"

نصیرن نے سر سے نفی کا اشارہ کیا۔ لیکن خواہش کے لفظ کو وُہ سمجھ نہ سکی۔ یہ کیسے پیدا ہوتی ہے۔ کب پیدا ہوتی ہے۔ یہ سمجھنا اُس کی فہم و فراست سے بالا تھا۔

نصیرن نے پوچھا۔ "تم سب نے شادی کی ہے؟"

اُن میں سے ایک نے جو جھاڑو سے بھی کھیل رہی تھی۔ اَور نصیرن کے

خد و خال کو بھی غور سے دیکھ رہی تھی۔ مسکرا کر جواب دیا۔" اوہو —— اب تک ماں باپ کے گھروں میں پڑی رہتیں؟ چشم بد دُور، ہم تو کبھی بچوں کی مائیں بھی بن گئی ہیں اور —— اور ——"

" اری —— اُٹھو بھی —— بچے بلک رہے ہوں گے۔" تیسری عورت نے جو اب تک کمر سیدھی کر رہی تھی، دونوں نوجوان عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

نصیرن بھی اُن کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ دراصل اب لوٹنے کا وقت آ پہنچا تھا۔

" تم اپنے بچوں کو کلِم نہیں کھلاتی!" نصیرن نے پوچھا۔

" کلِم کیا؟"

" دُودھ کا سفوف!"

اکّو

دُھوئیں سے زیادہ سیاہ کالی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ
کہ اُس کے پچکے ہوئے بے ڈول اور لمبوترے چہرے پر ہر وقت مُسکراہٹ
ہوتی ہے۔ اُس کی اندر کو دھنسی ہوئی سیاہ دائروں میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں
اگرچہ کبھی کبھی اُس کی ذہنی پریشانی کا پتہ دیتی تھیں، لیکن اُسکی مُسکراہٹ انجان آدمی
کو تذبذب میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔" اس کے پاس جوڑا ہوا سرمایہ
ہوگا۔ یہ آسودہ حال ہوگی۔ یہ اس قدر میلی اور گندی کیوں رہتی ہے؟ یہ بہاڑن
کا کام کیوں کرتی ہے؟" اور سچ مچ شروع شروع میں میں یہی سوچتا رہا۔
کام کرتے وقت جب وہ میری میز کے سامنے سے اپنے میلے
دوپٹے میں کوئی چیز چھپا کر مُسکراتی ہوئی نکل جاتی تھی۔ تو میری نگاہیں اس
وقت تک اُس کا تعاقب کرتیں۔ جب تک وہ دُودھ کی دکان سے
آگے اوجھل نہ ہوتی۔ کتنی بشاش عورت ہے۔ اور کتنی آزاد! گلہری کی

طرح دن بھر پھدکتی پھرتی ہے۔ کاش! میں بھی اسی طرح آزاد ہوتا۔ اسی کی طرح خوش و خرم۔ نہ یہ شکستہ کرسی ہوتی۔ نہ یہ سفیدے کی بنی میز اور نہ آمنے سامنے براجے ہوئے گھمبیر افسروں کا خوف! ایک چھوٹی سی دنیا ہوتی میری۔ کالی کی طرح چھوٹی سی جھونپڑی۔ ایک بے کیف بے سلسل پہاڑی کی چوٹی پر، جس کے دامن میں کالے ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی کول ناد کی سرمئی سڑک جا رہی ہے۔ اور اس کے نیچے نیلے پانی والا جہلم جھاگ اڑاتا ہوا، چٹانوں سے ٹکراتا ہوا آزاد اور بے پروا دریا ــــ!

صبح اور شام وہ ڈیروں میں پانی بھرتی ہے۔ چاول صاف کرتی ہے۔ برتن مانجھتی ہے اور پھر خوش خوش آنچل میں چاولوں کا ریزہ باندھ کر چلی جاتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی ہم شکل بیٹی۔ اکو ــ ناچتی کودتی ماں کا آنچل تھامے جاتی ہے۔ اس بکری کے بے بس بچے کی طرح جس کے تھنوں پر مالک نے کپڑے کی تھیلی چڑھا دی ہو۔ تاکہ بچہ راستے میں دودھ نہ پی جائے۔ وہ دودھ جس پر صرف مالک کا حق ہے۔ بچے کا نہیں!

کالی کی طرز زندگی پر مجھے لمحہ بہ لمحہ رشک آتا گیا۔ جو ایک بار میرے ضبط کے باوجود جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میں میز سے اٹھا۔ اور اندر کمرے میں ٹین کے بڑے صندوق پر لیٹ گیا۔ سوچنے لگا۔ یہ زندگی خصوصاً ہم کلرکوں کی زندگی جن کی روح خفتہ اور ضمیر مردہ ہے، کس قدر مقید ہے۔ خوف اور حرص کی

آہنی زنجیروں سے کسی ہوئی۔ جن سے عمر بھر چھوٹنے کی کوئی اُمید نہیں۔ کوئی اُمید نہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہو ــــــ تو کیا ہوا؟ ـــــ کیا ہوا؟ ہمیں اُن کتوں کی طرح مسکین اور بے نور آنکھوں سے دُنیا کی طرف دیکھنا ہوگا۔ جو کسی موٹے بنئے کو صبح سویرے حلوائی کی دُکان پر پوریاں اور حلوا کھاتے دیکھتے ہیں۔ اور تصور ہی میں لذّت کا احساس پیدا کرکے اپنے سیاہ نتھنوں پر خشک زبان پھیرتے ہیں۔ بنیا ڈکارتا ہوا اُٹھ کر چلا جاتا ہے اور کتے وہیں کسی دُوسرے کی آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ کسی میں دیا ہوئی۔ تو روٹھا چھوٹا ٹکڑا اُن کی طرف پھینک دیا۔ ورنہ نہیں۔ یا کسی بنئے نے کہہ دیا۔ "بڑے ذہین اور لالچی ہیں یہ سالے! منہ میں نوالا دیکھ کر جھٹ مچل اُٹھتے ہیں۔ انہیں میونسپلٹی کے ذریعے سے زہر دلوانا چاہیئے" اُن کے برعکس غنیمت ہے ہماری زندگی بھی۔ صبح اور شام روٹی تو میسّر ہوتی ہے۔ باقی رہی رُوح کی آزادی۔ وُہ نہ ہمیں ملنی چاہیئے نہ ہم اُس کے اہل ہیں۔ آزادی سے رُوح آزاد نہیں ہوتی۔ اگر وُہ بات ہوتی۔ تو نیجو جھیور سے کون زیادہ آزاد ہے۔ لیکن اُسی کو دیکھو۔ ہر وقت مایا کی جان کو روتا رہتا ہے۔ کبھی وُہ کسی سے اور کبھی کسی سے آنکھ لڑاتی ہے۔ عورت کیا ہے۔ آگ کا گولہ ہے جو بجھنے ہی میں نہیں آتا۔ نیجو دُودھ اور پکوڑیاں بیچ کر دن میں دو ڈھائی روپے بنا لیتا ہے۔ لیکن یہ سب پیسے یا چوکیدار کی نذر ہوتے ہیں یا تھانے کے مُسلمان محرر کی، جو روزنامچے میں مایا کے غائب ہونے کا اندراج کرتا ہے۔ عورت

اچھی اور نیک خصلت ہوتی۔ تو نیچو بادشاہ سے کم نہ تھا۔ کمانا بھی ہے لیکن رونا بھی ہے۔ جانے غریب نے پچھلے جنم میں کونسے کرم کئے تھے۔ جو اس جنم میں ایسی کُتیا گلے بندھ گئی۔ جیسے اوروں سے دُم سنگھانے ہی میں مزا آتا ہے۔ اور اُس کے مقابل میں یہ کالی ــــ آزاد اور بے پروا گلہری!

میس (MESS) کے ممبر میری طرح جذباتی آدمی نہیں تھے۔ انہیں نہ آزادی کی تمنّا ہے نہ غلامی کا افسوس! خچر کی طرح تین من بوجھ اُٹھانے کے عادی ہیں۔ مجھ سے ابھی تک اچھی طرح ہل جل بھی نہ گئے تھے۔ دونوں طرف سے ابھی نگاہیں ایک دوسرے کی سیرت ٹٹولتی تھیں۔ جو بے تکلّف ہونے کے لئے لازمی ہے۔ ایک ممبر کے گھر سے گلاس اور نئے بادام آ گئے تھے۔ دوسرا ممبر اُن کے جائز مصرف پر بحث کر رہا تھا۔ چیز ایسی نہیں۔ جسے زیادہ دیر رکھا جائے۔ اِس لئے تقسیم ضروری تھی۔ دُور افتادہ مقام پر کھانے پینے کی چیزیں بانٹنے سے آدمی کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا۔ اگرچہ تقسیم تلخ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن حاصلِ تقسیم بہت شیریں ہوتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں گلاس اور باداموں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر لگ گئے۔ ڈپٹی صاحب کا ڈھیر۔ نائب صاحب کا ڈھیر۔ ہیڈ کلرک کا ڈھیر۔ اکونٹنٹ کا ڈھیر۔ سید صاحب کا ڈھیر۔ بدری ناتھ کا ڈھیر وغیرہ اور سب سے بڑا ڈھیر اپنے لئے۔ اپنے میس کے لئے!

سات بج چکے تھے۔ آفتاب کی نورانی کرنیں سامنے والی پہاڑی

کی چوٹی کو چوم رہی تھیں۔ جن کے پرتو سے مزدور کی پیٹھ کی طرح کالی چٹانیں اور بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھیں۔ اور نیچے دریائے جہلم مست شرابی کی طرح چٹانوں سے ٹکراتا ہوا سنبھلتا ہوا جا رہا تھا۔ خانقاہ کے سفید اور قرمزی کبوتروں کا ڈار بیل گاڑیوں کی منڈیر میں پہنچ چکا تھا۔ سڑک پر رات کو ٹھہری ہوئی بسوں کی بھوں بھوں گونجنے لگی تھی۔

اسی وقت کالی آگئی۔ مسکرا مسکرا کر اس نے سب کو سلام کیا۔ اس کے ساتھ اکو بھی تھی۔ چھ سات برس کی بے فکر لڑکی۔ جو ماں سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہ ہوتی تھی۔ پھلوں کے ڈھیر دیکھ کر کالی کے ہونٹ مسکراتے مسکراتے کانوں تک پہنچ گئے۔ اور اکو کی ننھی آنکھیں پھیل کر بہت بڑی ہو گئیں۔ ٹاٹشی، ماں بیٹی کو دیکھ کر بھونکا نہیں۔ صرف دم ہلا دی شاید وہ ان سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔

کالی نے پوچھا۔ "یہ کہاں سے آئے بابو جی؟"

ایک ممبر نے جو بظاہر تمباکو پی رہا تھا۔ لیکن نگاہیں ڈھیروں پر لگی ہوئی تھیں۔ سر اوپر اٹھا کر کہا۔ "ہمارے گھر سے"

"پکے پھل ہیں۔ رسدار اور پرمزہ" کالی نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔

"میوے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جنہیں انسان کھاتا ہے" اس ممبر نے بے رخی سے جواب دیا۔

اکو ماں کی ٹانگوں سے جن کا حسن سوسی کے پھٹے اور پرانے کپڑوں نے اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ چمٹ گئی۔ اور اس کی آنکھیں ماں کے

چہرے پر جم گئیں۔ ماں نے ذرا تندی سے اُس کا سر دباتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو تمہیں بھی دیں گے۔"

سب ممبروں نے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر پہلے کالی کی طرف دیکھا اور پھر لوٹتی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف۔

"اکو گلاس اور بادام کھائے گی۔ کتنی واہیات خواہش! جس کے نزدیک چاول کا ریزہ رس گلے اور قلاقند کی لذّت رکھتا ہے۔ وُہ گلاس اور بادام کھائے۔ اُسے اِن چیزوں سے جنہیں صرف اِنسان کھاتے ہیں کیا سروکار؟"

دُوسرے ممبر نے جو زیادہ تیز مزاج مگر صاف دِل تھا۔ خشک سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "تم بھی پھل کھاؤ گی اکو؟"

اکو کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ وُہ ماں کی ٹانگوں سے الگ ہو کر برآمدے کے قریب آ گئی۔ اور آزاد اور بشاش کالی زور زور سے ہنسنے لگی۔

"نادان بچی ہے بابُوجی۔ جھٹ مچل جاتی ہے۔" کالی نے ہنستے ہنستے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں — ہم بھی بال بچے والے ہیں۔" تیسرے ممبر نے یہ کہہ کر تمام ڈھیروں سے سُرخی مائل سفید گلاس چُن لئے۔ اور تھوڑے سے بادام۔ اور اکو کو دیتے ہوئے کہا۔ "اب تو خوش ہو نا —"

کالی کی مسرّت دوگنی ہوگئی۔ ان مہربانوں نے اُس کی بچّی کی کتنی عزّت اور محبّت کی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہی کے دائرے چمک اُٹھے اور چہرے کی ٹیڑھی ترچھی جھرّیوں پر احسان اور عقیدت کے فسانے منقش ہو گئے۔

چوتھے ممبر نے جو سب ممبروں سے سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ حُقّے کی نے کو گھُماتے ہوئے کہا۔ "بچّوں کو اتنا نہیں مچلنے دینا چاہیے کالی! کسی وقت یہ بے عزّت کرا دیتے ہیں اور ایسے ان کی عادت بھی خراب ہو جاتی ہے۔"

کالی معنی کی گہرائی کو نہ پہنچ سکی۔ اُس نے اُسی طرح ہنستے ہنستے کہا۔ "سچ ہے بابو جی!" اور پھر دو ایک تھپڑ اکّو کے سر پر دے مارے۔ تاکہ اُس کی عادت ٹھیک ہو۔ اُسی وقت میرو بازار سے سودا لے کر آگیا۔ آتے ہی اُس نے نا اُمیدی کے لہجے میں کہا۔ "آج ٹاشی کے لئے غدود نہیں ملے جی۔"

سب چونک اُٹھے۔ "ایں —— نہیں ملے؟"

میرو نے کہا۔ "قصاب بدمزاج ہے۔ بات تک نہیں سُنتا۔ اور آج ٹاشی شوربے کے بغیر ——"

ٹاشی شوربے کے بغیر زندہ کیسے رہے گا۔ قصاب کی بدمزاجی نے اُسے آج جائز غذا سے محروم کر دیا تھا۔ بدمعاش قصاب! اچھا کا دو سال سے اُسی کی دُکان سے گوشت خریدتے آئے ہیں۔ پھر بھی اُسے

آدمی پہچاننے کا شعور نہیں۔"

کالی نے پانی کے لئے بالٹی اُٹھائی اور میرو سے پُوچھا۔" اِسے شور نہ دیتے ہو؟"

میرو نے چوکے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔" اور کیا دیں اس پہاڑ میں۔ بیچارہ آج صاف مر گیا۔"

"جب ہی تو بھُول گیا ہے۔" کالی نے کہا۔

دُودھ چُولہے پر گرم ہو رہا تھا۔ اُس کی بھینی بھینی خوشبو سارے برآمدے کو معطر کر رہی تھی۔ کالی پانی کی ایک بالٹی لے آئی۔ پھر دوسری ـــ پھر تیسری۔

ہم کپڑے بدل کر چارپائیوں پر بیٹھے دُودھ پی رہے تھے۔ اَور ٹاشی ہمارے سامنے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر زور زور سے دُم ہلا رہا تھا۔

ایک ممبر نے جو ٹاشی کا حقیقی اور لاشریک مالک تھا۔ اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔" تم بھی پیو گے دُودھ شیطان۔"

سب کھکھلا کر ہنس پڑے اور دُور گری ہوئی دیوار کے ملبے پر بیٹھی ہوئی کالی اَور اکو بھی۔

"دراصل کُتا بہت ذہین ہوتا ہے۔" ہم نے ایک دُوسرے سے کہا۔

ٹاشی مالک کی بات سُن کر اَور بھی مچل گیا اور نزدیک آکر زیادہ

زور سے اپنی گُچھے دار دُم ہلانے لگا۔

"میرو —— ٹاشی کی رکابی لا دینا بھئی ——" مالک نے کہا۔

ہم نے دُودھ کا تین چوتھائی حصہ پی لیا تھا۔ باقی دُودھ ٹاشی کا اضطراب دیکھ کر ہمارے حلق سے نہ اُترا۔ بے چارا بے زبان ہے اَور وفادار بھی۔ ہم سے نہ مانگے تو کس سے مانگے۔

"اسے بھی دُودھ دے میرو" کالی نے بیٹھے بیٹھے ہی نوکر سے کہا۔

میرو نے کہا۔ "میرے پاس کہاں ہے —— ہاہاہا ——"

ایک ایک کر کے ہم چاروں نے رکابی میں بچا کھچا دُودھ انڈیل دیا۔ ٹاشی نے مزے لے لے کر پیا۔ اَور نتھنے پونچھ کر ملبے کے ایک ڈھیر پر جا بیٹھا۔

جب کالی سستا کر جانے لگی۔ تو جاتے جاتے اکّو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹاشی کی رکابی کی طرف دیکھا جو اُس نے چاٹ کر صاف کی تھی۔ اَور پھر ہمارے پیالوں کی طرف جن میں دُودھ کی کچھ بوندیں تھیں۔ اُس کے پاؤں آنگن سے نہ نکلتے تھے۔ لیکن ماں اُسے گھسیٹ کر لے گئی کہ کہیں اُس کی عادت خراب نہ ہو۔

اُس کے جانے کے بعد سنجیدہ زد نمبر نے کہا۔ "بدتمیز ہوتے ہیں یہاں کے لوگوں کے بچے —— ہاہاہا —— نرا ڈنگر"

مَیں سارا دن ملول رہا۔ سوچتا رہا۔ کالی کس قدر آزاد ہے

اَور بشاش ! تمام حِس سلب ہو کر بھی خوش ! شاید حِس ضائع ہو کر اِنسان خوش ہی رہتا ہوگا۔ شاید ! اَور پھر مَیں ——— مجھے کیا چاہیئے مجھے ؟ ——— جو اِنسان ہے ——— اشرف المخلوقات ٭
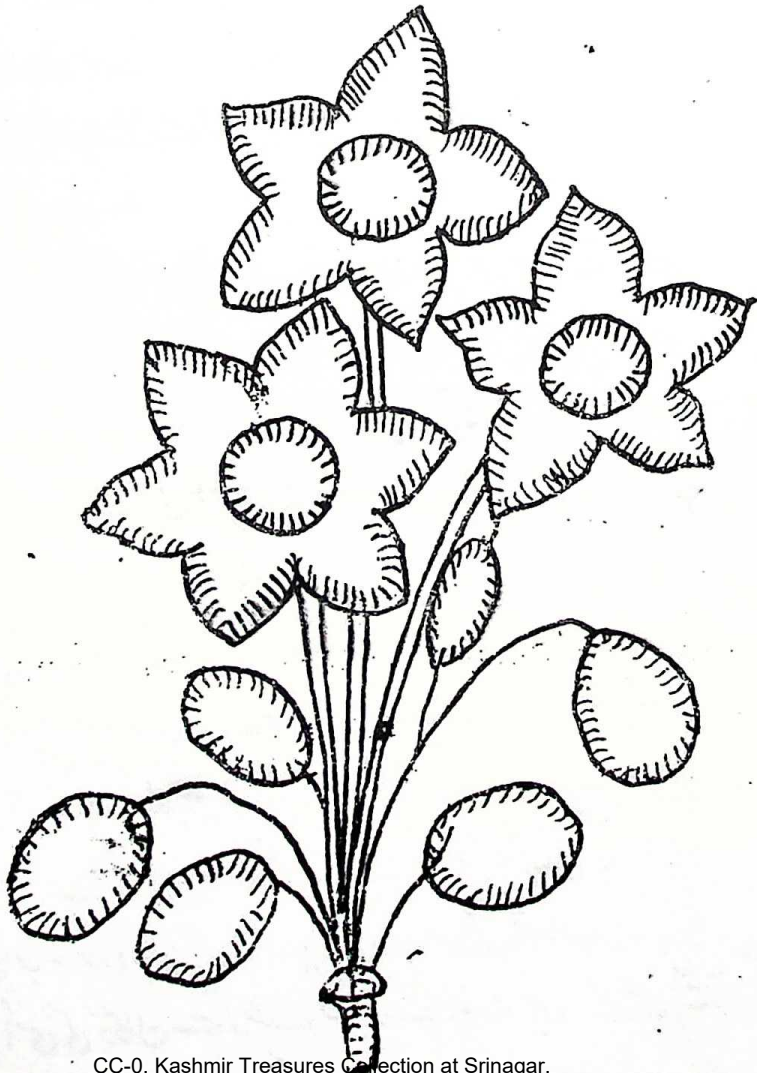
شو رُوم کی وُسعت میں سجائی ہوئی چیزوں سے وُہ بظاہر اپنے مذاق کے مطابق ایک چیز کا بھی انتخاب نہ کر سکا۔ اُسے تپائی، ٹیبل لمپ اور سگریٹ کیس سے زیادہ ایک سنگار بکس کی ضرورت تھی۔ لیکن ڈیزائن ـــــ وُہ خود بھی نہ جانتا تھا۔ کہ کونسا پسند کرے۔ بار بار اپنی بیوی کا معطر خط نکال کر پڑھتا تھا۔ جس میں لکھا تھا۔ "چیزیں بے حد خوبصورت اور جاذب نظر ہوں، بالخصوص میرا سنگار بکس ـــــ"

"بے حد خوبصورت اور جاذب نظر" کے صحیح معنی تلاش کرنے کے لئے اُس نے بار بار اپنے دماغ کے پوشیدہ کونے چھان ڈالے۔ لیکن وُہ سمجھ ہی نہ سکا۔ کہ پانسو میل دُور سے فرمائش بھیجنے والی بیوی نے اِن لفظوں کو کس پیرائے میں لیا تھا۔ اگر اُس نے خوبصورتی کو اپنی مخروطی اُنگلیوں، سفید پوست اور مخمور آنکھوں کے پیمانے میں تول

کر سنگار بکس کی فرمائش کی ہے ۔ تو شوروم ایسی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ صاف اور ستھرے سنگار بکس پالش سے جگمگا رہے تھے ۔ اور مالک دکان کی حریص نگاہیں اور چرب زبانی اُسے بہت کچھ خریدنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ لیکن وہ خود نفسیات کا معلّم تھا ۔ اُسے اپنے معیار اور اپنے پیمانے میں اُس جگہ ہر چیز کو تولنے کا حق تھا۔ جہاں اُس کی مخروطی اُنگلیوں والی بیوی نہ تھی ۔ اِسی لئے مالک دُکان کی حریص نگاہوں کی ہنسی اُسے پھانسنے میں ناکام رہی ۔ کیونکہ اُس کے نزدیک حُسن صرف رومانی تصوّر کا دھندلا سا نقش تھا ۔جس میں وہ اپنی زندگی، اپنے محسوسات، اور اپنے مذاق کا جھلملاتا ہوا عکس دیکھ سکتا تھا۔ یہاں نہ اُنگلیوں کی وضع قطع، نہ پوست کی بے نور رنگت اور نہ آنکھوں کی بے کیفی کو دخل تھا۔ سنگار بکس کا تحفہ اُسے اپنی بیوی کو پیش کرنا تھا ۔جس کے حُسن میں وُہ دراصل اپنے رومانی تصوّر کی عکاسی دیکھنے کا خواہشمند تھا۔

"مجھے کوئی ڈیزائن پسند نہیں ۔۔۔!" اُس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہی ۔۔۔ ہی ۔۔۔ ہی" دکان کا مالک غیر ارادی طور پر ہنسا۔ شوروم کی ساری وُسعت وحشیانہ قہقہے سے لرز اُٹھی ۔ پھر وُہ اُس کے قریب آ کر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا ۔ ایک دراز قد جنٹلمین، جس کے چہرے کی بدصورتی کو چیچک کے ناتراشیدہ داغوں نے دوبالا

جا سکتی تھیں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ پیٹ پر قدرت نے آگ کے قلم سے نقش و نگار بنائے تھے۔

مالک دکان نے پُر مسرت لہجے میں کہا۔ "ماہم دینا" اور پھر نفسیات کے معلّم سے کہا "یہ ہے صاحب ہمارے کارخانے کا تجربہ کار کاریگر جس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں نیویارک، لنڈن۔ وائنا اور استنبول تک پہنچ گئی ہیں ——"

نفسیات کا معلّم اور حسین سنگار بکس کا خریدار ٹھٹھک گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے بدمذاق اور غیر آراستہ کمرے میں بیٹھے ہوئے نیم عریاں انسان نے اُس کے غرور کو جھٹلا دیا۔ جو شاید مغرب اور مشرق کی تعریف تک سے نامحرم تھا۔ جسے شاید اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ ان پچیس سالوں میں دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ لیکن جو اسی کمرے میں آج سے کئی برس پیشتر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر اپنے آہنی قلم سے تہذیب انسان کی بدلتی ہوئی لافانی تصویریں بنا رہا تھا۔

ماہم دین نے قلم ہاتھ سے رکھا۔ اور چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ پھیلا کر بولا۔ "سلام حضور!"

نفسیات کا معلّم "سلام حضور" سُن کر چونک پڑا۔ اُس نے مصنوعی طور پر ہنس کر کہا۔ "سلام ہے ——"

وُہ اپنی پتلون کو اُوپر کھینچ کر کاریگر کے پاس بیٹھنے لگا۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ وُہ کن چیزوں پر نقش کر رہا ہے۔

مالک دُکان نے جھٹ اُس کا ہاتھ روک کر کہا۔ "ہائے ہائے! کہاں بیٹھنا چاہتے ہیں حضور! یہ جگہ —— یہ —— ناصاف ہے۔" ماما دین بھی خریدار کی اِس بدتہذیبی پر گھبرا اُٹھا۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ قیمتی لباس میں ملبوس جنٹلمین اُس کے برابر بیٹھ جائے وُہ کھونٹی سے کپڑے کی چادر اُتارنے کے لئے دوڑا۔ تاکہ اُسے چٹائی پر بچھا کر ناصاف جگہ کو خریدار کے بیٹھنے کے قابل بنا سکے۔ اور نفسیات کے معلّم کو بھی نہ جانے کیا یاد آیا۔ اُس نے پتلون کو پھر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ناصاف جگہ —— نفسیات کا معلّم! کارڈ مخمل کا پتلون —— عزّت، شہرت!"

مالک دُکان اُس کا بدلتا ہوا ارادہ تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا "حضور آپ کس جگہ بیٹھنے لگے تھے۔ اگر آپ یہ چیز دیکھنا چاہتے تھے۔ تو ہم اِسے دفتر میں منگا سکتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ہماری بےعزّتی ہے۔ کہ ایسی مشہور دُکان پر آیا ہوا خریدار ایک . . . . . معمولی کاریگر کے پاس بیٹھے۔ اور اِس چٹائی پر . . . . . ہاہاہا ——"

نفسیات کا معلّم دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ "ماما دین کا وجود بھی ایک حُسن ہے۔ دماغی حسن۔ جو جسمانی حُسن سے بالکل مختلف ہے۔ اور بے پروا —— اور مشرقی آرٹ کی طرح واضح، عیاں اور اپنے سے مطمئن —— !"

اُس نے مالک دکان کی باتیں توجہ سے نہ سُنی تھیں۔ تاہم اُس نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔"

مالک دُکان نے وُہ لکڑی کا ٹکڑا دکھایا۔ جسے مام دین رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔

"یہ ایک انگریز کی فرمائش ہے حضور! ایک سگریٹ کیس۔ آج پندرہ دِن کے بعد تیار ہو گیا ہے۔ یہ دیکھیے باریک کام۔ یہ بیل بوٹے کس محنت اور جانفشانی سے اُبھارے گئے ہیں۔ اور پھر انہی بیل بوٹوں میں یہ چھوٹا سا مونوگرام (W.D) ولیم ڈیوس! ——"

وُہ اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ اور مام دین کی سُوکھی سُوکھی ٹانگیں میلی شلوار میں کانپنے لگیں —— کانپنے لگیں کہیں یہ جنٹلمین نقش ونگار میں کوئی نقص نہ نکالے۔

وُہ کبھی کبھی مام دین کی طرف بھی اپنی ضرورت سے زیادہ چمکیلی آنکھوں سے دیکھتا گیا۔ اُسے اُس کے سُوکھے بدن میں صرف حُسن ہی حُسن، نزاکت ہی نزاکت، رنگینی ہی رنگینی نظر آئی۔ تجربہ کار کاریگر جس کے دماغ کا حُسن اب بھی وائنا اور استنبول کی عالیشان عمارتوں کی زینت بنا ہُوا تھا۔ لیکن جو خود میلی سی شلوار میں ایک بدمذاق کمرے کی چٹائی پر زندگی کے دِن پورے کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے مالک دُکان سے پوچھا "اِس سگریٹ کیس کی کیا قیمت ہوگی ——؟"

مالک دکان نے مام دین کی موجودگی ہی میں مسکرا کر کہا۔ "واجبی دام ہیں حضور! آپ سے رعایت ہی ہوگی۔ دراصل انگریز لوگ قیمتوں کی

اُلجھنوں میں زیادہ نہیں پڑتے۔"

اُس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے پوچھا۔"پھر بھی ہم سے کیا لیں گے؟"

مالک دُکان نے فخریہ لہجے میں کہا۔" انگریز سے ساٹھ روپے۔ اگر آپ پسند کریں تو صرف پینتالیس!"

معلّم کے دماغ میں دوبارہ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں کا تضاد گھومنے لگا۔ انگریز سے ساٹھ۔ اور ہندوستانی سے پینتالیس پوشیدہ اور عیاں؛ محتاج اور واضح!

وُہ زور سے ہنسا۔ بہت زور سے حتیٰ کہ لرزتا ہوا مام دین بھی اپنی دبی ہوئی مسکراہٹ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔" انگریز سے ساٹھ اور مجھ سے پینتالیس ــــ ہاہا ــــ ہا ــــ"

پھر اُس نے مام دین سے کہا۔" استاد ہمیں ایک سنگا رکیس کی ضرورت ہے۔ جس پر کوئی خوبصورت سی چیز ہو۔ میرا مطلب ہے ہمارے مذاق کے مطابق بیل بُوٹے نہیں۔ ڈنٹھلوں سے لپٹی ہوئی پھلیاں نہیں۔ بس کوئی جانور، کوئی پرندہ، اُڑتا ہوا، بھاگتا ہوا، آزاد اور مسرور۔ خوبصورت اور جاذب نظر! سمجھ گئے ــــ؟"

مام دین نے مالک دکان کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اچھی بات ہے حضور! بنا دُوں گا۔ انشاء اللہ آپ پسند کریں گے۔"

اُس نے پھر کاریگر کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مثلاً

چڑی مار، عقاب، باز، شیر ببر، یعنی جس کا شعار آزادی ہو۔ جس کا مقصد ——— جس کا مقصد بس آزادی ہو۔ صرف آزادی ہو ——— سمجھ گئے؟"

مام دین کی بے کیف آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔ اُس کے بے نُور چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ آہستہ سے بولا۔ "سمجھ گیا حضور۔ زندگی یہی سمجھتے سمجھتے گزر گئی ——— یہی بناتے بناتے گزر گئی ——— یہی عقاب اَور باز، چڑی مار اَور شیر، بُدھ اَور کنول۔ لیکن آپ مطمئن رہیں حضور کی چیز ان سب سے نرالی ہوگی ———"

نفسیات کے معلّم نے لمبی سانس کھینچی۔ ذہنی کوفت کا وہ انتعاش جو اُس کی رُوح تک کو چھُو چکا تھا۔ ختم ہو گیا۔ ایک نرالی چیز ——— نہ عقاب نہ باز ——— صرف آزادی کے صحیح معنی لئے ہوئی نئی تصویر جس کا عکس صرف مام دین کے رومانی تصور پر پڑ چکا تھا۔ اَور نفسیات کا معلّم اُس سے بے خبر تھا ——— مطلق ناواقف!

اُس نے مطمئن ہو کر کہا۔ "اگر چیز ہماری پسند کی ہوگی۔ تو ہم تمہیں انعام بھی دیں گے۔"

اَور پھر انعام کا معیار قائم کرنے کے لئے اُس نے شکارے میں بیٹھ کر مالک دکان سے پُوچھا "اِس کاریگر کی روزانہ اُجرت کتنی ہے؟"

مالک دکان نے مُسکرا کر کہا۔ "حضور پہلے تو بارہ آنہ تھی۔ اب

پُورا روپیہ لیتا ہے۔ حساب کے معاملے میں بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔"
نسکارے ہیں بیٹھے بیٹھے وُہ سوچتا رہا۔ انگریز سے ساٹھ۔ ہندوستانی سے پینتالیس اور حساب کے معاملے میں بڑے ڈھیٹ کاریگر کو صرف پندرہ روپے۔ جس کے نام کی بنیاد تک زمانے نے رگڑ رگڑ کر مٹا دی ہے۔ جسے شاید اِس کا بھی احساس نہیں کہ اُس کے اصلی نام کا مفہوم کیا ہے۔ اور اب شہرت یافتہ لیکن مخفی نام کا مطلب کیا——!

دس دِن کے بعد وُہ پھر کارخانہ میں آگیا۔

رام دین اُس کے سنگار بکس پر سنگ خارا سے پالش کر رہا تھا۔

اُس نے دیکھا۔ سنگار بکس پر ایک اژدہے کی تصویر کھُدی ہوئی ہے۔ جو مُنہ کھولے کِسی چیز کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے۔

وُہ مسرّت سے جھُوم اُٹھا۔ "واہ وا! خُوب چیز ہے۔" اُس نے مالک دُکان سے کہا۔ "بالکل میرے مذاق کے مطابق۔ آزاد۔ بے پروا اژدہا—— جو تہذیب کا قائل نہیں۔ جو مذہب کا پروردہ نہیں۔ جو صرف آزاد ہے—— آزاد۔"

رام دین اپنی چیز کی تعریف سُن کر خوشی سے تھرتھرانے لگا۔ اُس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔

نفسیات کا مُعلّم ایک نظر سے سنگار بکس کو دیکھ رہا تھا۔ اور

دوسری نظر سے دماغی حسن کے سراپا مجسمے کو ــــ معاً اُسے محسوس ہوا جیسے اژدہے کی چوبیں آنکھوں میں نفرت، کشمکش، اور انتقام کی بے پناہ آگ دہک رہی ہے۔ اور جیسے وہ سارے کرۂ ارض کو ڈسنے، اپنے زہر سے تباہ و خاکستر کرنے کے لئے بھاگا آرہا ہے۔

اُس نے کتنی ہی دیر تک مام دین کے چہرے اور نحیف جسم کی طرف خاموش مگر لرزاں نگاہوں سے دیکھا۔ لحظہ بہ لحظہ اُسے شک ہوا یہ اژدھا نہیں۔ یہی کانپتا ہوا مام دین ہے۔ یہی مُعمر کاریگر پیچ تانبے کی طرح سیاہی مائل سُرخ اور نیم عُریاں اِنسان۔ جو اِنگریز اور ہندوستانی، مغرب اور مشرق، تہذیب اور مذہب سبھوں سے اپنا اِنتقام لینے کے لئے بھاگا آرہا ہے۔

اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ بے اختیار ہو کر اُس سے کہا۔ "مام دین،"

"جی حضور!"

"... مام دین ــــ ما ــــ م ــــ دین" اُس نے زیادہ بے تابی سے کہا۔

"حضور کیا بات ہے۔ ڈیزائن پسند نہیں؟" مام دین نے کانپتے کانپتے پوچھا۔

"بہت اچھا ڈیزائن ہے۔ بہت اچھا۔ لیکن ہمیں معاف کر دو۔ معاف کر دو۔ ہم نے تمہیں پہچانا نہیں۔ مغرب اور مشرق۔ انگریز

اور ہندوستانی سب کو معاف کر دو۔ سب کو بخشو۔ اپنا پھن سمیٹ لو۔ اپنا زہر نگل جاؤ ــــــ"

وہ جلد جلد سیڑھیاں اُترا۔ اُس کی سانس پھول چکی تھی۔ رگ رگ پھڑک رہی تھی۔ چمکیلی آنکھوں میں یاس پھیل گئی تھی۔ اور مُنہ سے تعفن سا آرہا تھا۔

"ہمیں معاف کر دو۔ بخشو۔ ہم بے گناہ ہیں۔ زمانے کو ڈسو! تہذیب اور مذہب سے اِنتقام لو ــــ لیکن ہمیں بخشو۔ بخشو! معاف کر دو ــــ!"

اور رام دین اپنے کمرے کی کھڑکی سے کہہ رہا تھا "حضور میرا اِنعام! اے حضور ــــ اے حضور۔ اِنعام!"

مالکِ دُکان دونوں کی سراسیمگی اور دیوانگی پر حیران ہو رہا تھا۔
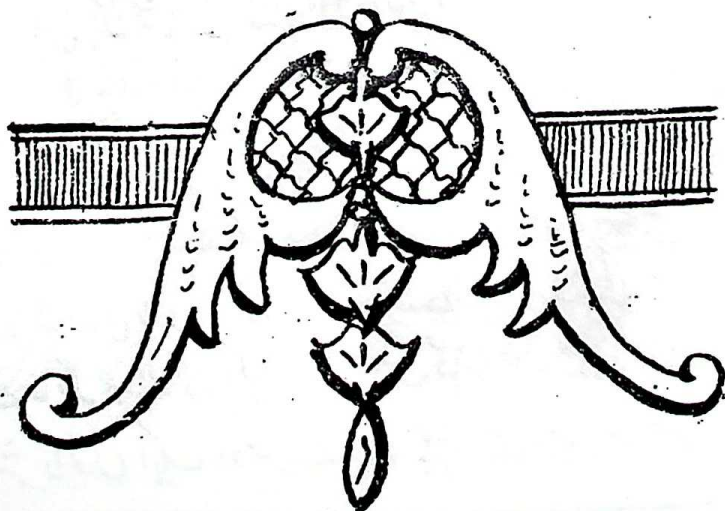
سکھو کی واپسی

(۱)

بیوی کے مر جانے پر نریندر کی عمر بیس سال کی تھی۔ یہ اُس کا آخری سہارا تھا۔ جو موت کے بے درد ہاتھوں نے اُس سے چھین لیا۔ صرف چھینا ہی نہیں بلکہ شاما کی تائید نے اُس کی مصیبتوں میں اضافہ کر دیا۔

اُس کی بیوی حسن اور شباب کی دیوی تھی۔ نریندر اُسے دیکھ کر ساری دُنیا کو بھول جاتا۔ جب تک وہ زندہ رہی۔ نریندر کے گھر میں مسرت اور شادمانی رہی۔ دونوں نہ صرف ازدواجی زندگی ہی بسر کرتے تھے۔ بلکہ محبت کی پاکیزہ اور حسین دُنیا میں بھی رہتے تھے۔ اور اکثر راتوں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر کھو

جانتے تھے۔

جب وہ بیمار پڑی۔ تو نریندر نے اُس کا علاج کرانے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ جہاں کہیں ڈاکٹر تھا۔ حکیم تھا۔ وئید تھا۔ پیر اور فقیر تھے۔ اُنہیں گھر بلایا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ تھیلیوں کے منہ کھلے رکھے۔ لیکن موت نہ محبّت کو دیکھتی ہے نہ حُسن کو اور نہ دولت کو۔ وُہ خاموشی سے اپنا کام کر کے چلی جاتی ہے۔

تیمارداری کے دنوں میں نریندر کی صورت ہی بگڑ گئی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر آنکھیں اندر کو دھنس گئیں۔ ڈاڑھی انچ انچ بھر بڑھ آئی۔ بدن سُوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ کپڑے مہینہ بھر سے نہ بدلے۔ اب نہ اس کا کارخانے میں دِل لگتا تھا۔ نہ بیمار بیوی کو دیکھ کر گھر میں چین آتا تھا۔ کتنی ہی بار اُس کی بیوی نے پُوچھا۔ "آپ میرے لئے اِتنا غم کیوں کھاتے ہیں؟"

اُس وقت نریندر کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہوتیں۔ وہ کچھ نہ کہہ سکتا۔ صِرف آنسو بھری نظروں سے اُسے دیکھتا۔ اُس کی بیوی اُس کا غم غلط کرنے کے لئے کوئی اور بات چھیڑتی۔ کیونکہ وُہ جانتی تھی۔ کہ نریندر کو اُس سے محبّت ہی نہیں بلکہ محبّت کا جنون ہے۔ لیکن نریندر کسی بات میں بھی دلچسپی نہ لیتا۔ اُسے ساری دُنیا جلتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جب وُہ مر گئی۔ تو نریندر کی دُنیا تاریکیوں سے بھر گئی۔ اسے محسُوس ہُوا۔ جیسے اِس وسیع دُنیا میں وُہ اکیلا رہ گیا۔ اور اُس کا ساتھی اسے دھوکا

دے کر چلا گیا۔ اُس نے کئی بار اپنے آپ کو ختم کرنے کی سعی کی۔ لیکن شاما کی محبت میں کچھ نہ کر سکا۔ یہ اُس کی بیوی کی آخری اور پاکیزہ نشانی تھی۔ جو مرتے دم اُس نے اپنے خاوند کے حوالے کی تھی۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں اور ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ "شاما کا خیال رکھنا۔ دوسری شادی بھی کرو گے تو اِسے نہ بھولنا۔"

اُس وقت نریندر کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ اُس نے چاہا تھا کہ موت کے ساتھ مقابلہ کرے۔ اُسے ساری دولت دے کر ٹال دے لیکن آج تک ایسا کس نے کیا ہے؟ کون کر سکا ہے؟

(۲)

چار سال تک اُسے دُوسری شادی کا خیال نہ آیا۔ جو دوست اور رشتہ دار دُوسری شادی کا مشورہ دیتے۔ اُنہیں وُہ حقارت بھری نظروں سے دیکھتا۔ اور کہتا۔ "کیا مرد اِس قدر ذلیل ہیں کہ اپنی بیوی کے لئے اپنا سُکھ بھی قربان نہ کر سکیں؟"

اُس کے دوست ہنستے۔ اور بے تکلفی سے کہتے۔ "ہمارہ تو اِنہ یہ فلسفہ تو کئی رنڈیوں نے شروع شروع میں بگھارا تھا۔ لیکن بعد میں وُہی حقیر تنکوں کی طرح سیلاب عشق میں بہہ گئے۔"

نریندر جواب دیتا۔ "مجھے اُن رنڈیوں میں شمار نہ کریں۔ میں سیدھا سادا آدمی ہوں۔ ایک پاکیزہ اصول کا قائل!"

اُس وقت اُس کی آنکھیں غمناک ہوتیں۔ اور اُس کے برابر بیٹھے ہوئے دوست اور رشتہ دار چُپ ہو جاتے اُن کے دِل میں نرہندر کی عزّت بڑھ جاتی۔

اُس نے شیاما کی پرورش کے لئے ایک دایہ رکھی تھی۔ اگرچہ اُسے اپنے قدیمی نوکر سکھو پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ لیکن اُسے معلوم تھا کہ سکھو کی عُمر بیت چکی ہے۔ اور اب پانچ سالہ بچّی کی پرورش کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں۔ شیاما کے لئے سکھو کا پیار ہے لیکن خدمت نہیں۔

ساتھ ہی ساتھ اُس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ گھر میں شیاما اور سکھو نہ ہوتے تو شاید وہ سنیاس دھارن کر لیتا۔ لیکن اِن کی محبّت ہمیشہ اُس کے راستے میں کھڑی ہو جاتی۔ اُسے اب نہ اپنے گھر میں دِلچسپی تھی۔ نہ کارخانے میں۔ ایک قیدی کی طرح جس کی میعاد قید غیر متعین ہو وُہ دِن بھر کارخانے میں رہتا۔ اور شام کو گھر لوٹتا۔ اُسے ہر چیز میں ایک مجبوری سی دکھائی دیتی۔ وُہ بشاشت وہ سکون جو چار سال پہلے اُسے حاصِل تھا۔ اب مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔

وُہ صُبح سویرے بستر سے اُٹھتا اور مندر چلا جاتا۔ گھنٹوں وہیں برآمدے میں بیٹھتا۔ یہاں اُسے عارضی سکون سا ملتا۔ جاننے پہچاننے لوگ اُسے عزّت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ اور ایک دوسرے سے کہتے "دیوتا ہے۔ بیوی کیا مر گئی اپنے من کو مار لیا۔ اب پربھو کا کیرتن کرتا ہے۔"

مندر میں ایک حسین لڑکی بھی آتی تھی۔ شکل و صورت سے معلوم ہوتا تھا۔ بڑے گھرانے کی ہوگی۔ اور کافی تعلیم یافتہ بھی۔ وہ اکثر نریندر کو مندر کے برآمدے میں اُداس بیٹھے دیکھتی۔ تو دل ہی دل میں سوچتی۔ "اِسے کیا روگ ہے۔ اِتنا خوبصورت اِتنا جوان آسمان کے تارے بھی توڑ کر لانا چاہے تو لا سکتا ہے۔ پھر اُداس کیوں ہے؟"

نریندر بھی اُسے دیکھتا۔ کبھی دیکھ کر دُوسری طرف مُنہ پھیر لیتا اور کبھی تنگ ہو کر آنکھیں بند کر لیتا۔ وہ لڑکی اُس کے پاس سے گزر جاتی۔ اِس کے کپڑوں کی خوشبو کافی دیر تک نریندر کے دماغ کو مہکائے رکھتی۔

ایک دِن نہ جانے نریندر کو کیا ہو گیا۔ اُس کے دِل میں ہزاروں سُوئیاں چبھ گئیں۔ اُٹھ کر گھر چلا گیا۔ سوچتا رہا۔ "آج مجھے کیا ہو گیا۔ میرے دِل میں یہ کمزوری کہاں سے آ گئی؟"

اُسے محسُوس ہوا۔ جیسے اُس کے گلے میں رسی باندھی گئی ہے۔ اور کوئی اَن دیکھی طاقت اُسے گھسیٹ کر لے جا رہی ہو۔ سکھو چائے لے کر آ گیا۔ تو حیران رہ گیا۔ نریندر کُرسی پر گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ سکھو نے کہا۔ "سرکار!"

نریندر نے گردن اُٹھائی۔ آہستہ سے کہا "لے آؤ بابا۔"
سکھو نے تپائی پر چائے رکھی اور باہر جانے لگا۔

نریندر نے پُوچھا۔ "شیاما نے چائے پی لی؟"
سکھو ایک دو قدم واپس آ گیا۔ ہنس کر بولا۔ "پی لی سرکار۔"

(۳)

نریندر اب مندر میں سکون حاصل کرنے کے لئے نہیں جاتا تھا بلکہ کرشنا کو دیکھنے کے لئے۔ اُس سے باتیں کرنے کے لئے دونوں میں اِس حد تک محبت ہو گئی تھی کہ مندر کے دیوتا کے سامنے اُنھوں نے شادی کرنے کا اِقرار بھی کر لیا تھا۔ وُہ گھنٹوں مندر کے باغیچے میں بیٹھتے اور باتیں کرتے۔ نریندر اِس حد تک بدل چکا تھا۔ کہ زنگ آلود لوہے کی طرح جسے مسلسل طور پر استعمال کیا جائے اُس میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وُہ چہیتی لیکن مرحوم بیوی کو بھی فراموش کر چکا تھا۔ رات اور دِن نئی دُنیا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور اِنہی خوابوں میں ڈُوبا رہتا تھا۔ شام کو بھی کارخانے سے گھر آنے کی بجائے کرشنا کے ساتھ سیر کو جاتا۔ اور رات گئے وہاں سے واپس لوٹتا۔

ایک دِن شام کو وُہ دونوں سیر کو نکلے تھے۔ آسمان پر چاند بھی تھا اور بادل بھی تھے۔ نریندر کے مُنہ میں سگریٹ تھا وہ لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔

ایک جگہ اچانک ٹھٹک کر اُس نے کرشنا سے پُوچھا۔ "تم مندر

میں کیوں آتی ہو کرشنا؟"

کرشنا اُس کا مطلب تاڑ گئی۔ بولی۔ "دیوتا کے لئے۔"

نریندر نے پوچھا۔ "اور میری طرف کیوں دیکھتی رہتی ہو۔"

کرشنا کے گالوں پر سُرخی چھا گئی۔ جلد جلد اُس نے کہا۔ "آپ کی طرف تو کبھی نہ دیکھا۔ اُلٹا آپ ہی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔"

نریندر نے ہنس کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ کاش تم مندر میں آیا ہی نہ کرتیں۔ تم نے تو میری دُنیا ہی بدل دی۔"

کرشنا نے کہا۔ "الزام میرے سر تھوپتے ہیں۔ آخر میرے چہرے پر کیا دھرا ہے۔ جس کی طرف آپ دیکھ رہے ہیں۔"

نریندر نے لمبی آہ کھینچ کر کہا۔ "یہ میری آنکھوں سے پوچھو کرشنا اُنہوں نے تمہارے چہرے پہ کیا دیکھا۔"

کرشنا نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا دیکھا۔"

نریندر نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ "اپنی مرحوم بیوی کا حُسن! اُس کی لافانی محبت!"

کرشنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ "آپ دقیانوسی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ جو تیر کمان سے نکل گیا۔ اُس کا افسوس کیا۔ شکر کیجئے آپ کے کوئی بچہ نہیں۔ نہیں تو مُصیبت ہوتی۔"

نریندر چونک پڑا۔ بولا۔ "کونسی مُصیبت؟"

کرشنا نے ساڑھی کے پلے کو گھماتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ "کون اُسے پالتا۔ کون اُس کی دیکھ بھال کرتا۔ بیوی کے بعد اُس کا بچہ ایک بوجھ سا معلوم ہوتا ہے۔ مرد کے لئے بھی اور دوسری بیوی کے لئے بھی؟"

نریندر نے آہستہ سے کہا۔ "اگر میرے کوئی بچہ ہو —— تو ——"

کرشنا نے چونک کر پوچھا۔ "ہے کوئی؟"

نریندر نے کہا۔ "اگر ہو۔ تو تم شادی نہ کرو گی؟"

کرشنا خاموش ہو گئی۔ دُور کھیتوں کی طرف دیکھ کر اُس نے آہستہ سے کہا۔ "مشکل ہی ہو گی۔"

نریندر بے بس سا ہو گیا۔ اُس نے چاہا کہ کرشنا سے کہہ دے شیاما میری بچی ہے۔ لیکن جنونِ محبت میں وہ ہونٹ نہ ہلا سکا۔

چاند اب بادلوں کے پیچھے چھُپ گیا تھا۔ کرشنا نریندر کی بے بسی بھانپ گئی۔ اُس نے دوبارہ پوچھا۔ "آپ کے کوئی بچی ہے؟"

نریندر نے جلد جلد اپنے راز کو ظاہر نہ کرنے کے لئے کہا۔ "نہیں۔ نہیں تو ——"

کرشنا نے فراغت کا سانس لیا۔ اور مسکرا کر بولی۔ "گڈ لک!"

چاند کبھی بادلوں سے نکلتا تھا۔ اور کبھی اُن میں چھُپ جاتا تھا۔

اور نریندر اور کرشنا آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے سیر سے واپس آرہے تھے۔ جانے کے وقت نریندر خوش ہی نہیں بلکہ مست تھا۔ واپسی پر وُہ ڈوبا ہوا سا تھا۔

اُس رات وُہ گھر میں سو نہ سکا۔ کبھی کرسی پر بیٹھا۔ کبھی پلنگ پر لیٹا۔ کبھی کمرے میں ٹہلا۔ سوچتا رہا۔ مجھے کیا ہو گیا۔ مَیں نے کیوں کرشنا سے نہیں کہا۔ "شیاما میری بچی ہے۔ تمہیں منظور ہے تو میرے ساتھ شادی کرو۔"

کبھی سوچتا۔ کرشنا کی بات بھی صحیح ہے۔ سچ مچ پہلی بیوی کی اولاد باپ کے لئے ایک مصیبت ہوتی ہے۔ اَور خصوصاً نابالغ بچے۔ دوسری بیوی کو کیا پڑی ہے۔ کہ اپنی سوت کے بچوں کو پالتی پھرے۔

(۴)

کئی دن بیت گئے۔ سکھو اپنے مالک کا سب کچھ بھانپ گیا تھا۔ وُہ مالک کی بدلی ہوئی ذہنیت پر کبھی کبھی رو اُٹھتا۔ ایک دِن شام کو نریندر نے سیر سے آتے ہی اُسے بُلایا اَور کہا۔ "سکھو بابا!"

سکھو نے آکر حیرانی سے پُوچھا۔ "ہاں مالک!"

نریندر نے کہا۔ "ایک بات کہوں۔ مانو گے؟"

سکھو نے بے تابی سے کہا۔ "مانوں گا کیوں نہیں۔ جس کا

نمک عمر بھر کھایا۔ اُس سے آنکھیں کیسے پھیر لوں۔"

نریندر تھوڑی دیر کے لئے اپنے سامنے لٹکتی ہوئی مرحوم بیوی کی تصویر کو دیکھنے کے بعد بولا۔ "تم جانتے ہو سکھو۔ میں جوان ہوں پیسے والا ہوں، حسین ہوں . . . ."

اِس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ اور بوڑھا سکھو کانپتا ہوا ذرا نزدیک آگیا۔

نریندر نے فرش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چار سال میں اپنے آپ پر قابو رکھ سکا۔ بدمست ہاتھی کی طرح اپنے جوان دل کو آہنی زنجیروں سے باندھ رکھا۔ لیکن اب — اب۔"

سکھو زیادہ بے تاب ہو گیا۔ بولا۔ "اب کیا ہوا مالک؟"

نریندر نے ناخن سے فرش پہ لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں شادی کر لوں گا۔"

سکھو نے اطمینان کا سانس لیا۔ جھوم کر بولا۔ "تو روکنے والا کون ہے سرکار؟ آپ نہیں دیکھتے۔ گھر اُداس ہے۔ آپ اُداس ہیں۔ شیاما اُداس ہے۔ میں اُداس ہوں۔ اور تو اور وہ رات ہی کیا جس میں چاند نہ ہو۔ وہ راجا ہی کیا جس کی رانی نہ ہو۔ وہ گھر ہی کیا جہاں عورت نہ ہو۔ کیجئے مالک ضرور کیجئے۔ میرے لئے کیجئے۔ شیاما کے لئے کیجئے۔ اِس بھرے گھر کے لئے کیجئے۔"

نریندر نے گردن اوپر اُٹھائی۔ سکھو کی طرف دیکھا۔ اور

زیرِ لب مُسکرا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ "لیکن تمہیں ایک کام کرنا ہوگا بابا؟"

سکھو ابھی تک مسرّت سے جھُوم رہا تھا۔ اُس نے پوچھا۔ "کونسا؟ انتظام؟ وُہ تو مَیں کر ہی لُوں گا۔ کیا مجال کسی چیز کا نقصان ہو۔"

نریندر نے کہا۔ "نہیں انتظام نہیں۔ لیکن سُننے سے پیشتر وعدہ کرو۔ کہ کسی پر ظاہر نہ کرو گے۔"

سکھو نئے گھر کے خواب دیکھ رہا تھا۔ نئی رانی کا خوبصورت تصوّر اُس کے دماغ پر چھایا گیا تھا۔ اُس نے کہا۔ "کہہ دیجئے ایشور کی سوگند۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔"

نریندر نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔ "شیاما کو تم لے جاؤ۔"

سکھو اب تک کھڑا تھا۔ اب اُس سے نہ رہا گیا۔ اُسے محسُوس ہُوا جیسے وہ پہاڑ کی چوٹی سے گرا جا رہا ہو۔ وُہ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا۔ فرش پر بیٹھ گیا۔ اُس کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔ آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ بولا۔ "شیاما کو؟"

نریندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہاں! آج سے اُسے مَیں تمہیں دیتا ہوں۔ جب تک مَیں اجازت نہ دُوں اُسے اِس گھر میں نہ لانا۔ اور نہ خود آنا۔ مَیں اُس کی پرورش کے لئے تمہیں

ہر مہینے روپیہ پیسہ دیا کروں گا ۔ تم اُس کی پرواہ نہ کرنا ۔"
سکھو نے حیرانی سے کہا۔" مالک !"
نریندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے ۔ وہ ضبط کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں سکھو۔ وعدہ نہ بھول جانا۔"
اُسی وقت دروازے پر شیاما آگئی ۔ باپ کو دیکھ کر مسکرائی ۔ اور پاپا کہتی ہوئی دوڑ کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی ۔
نریندر نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ ماتھے کو چوما ۔ اور سکھو کی گود میں رکھ کر آپ باہر چلا گیا ۔
سکھو بابا دونوں کو دیکھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا ۔
شیاما کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ۔ "میری بچی !"

(۵)

شیاما اور سکھو چلے گئے تھے ۔ دایہ کو بھی گھر سے جواب مل چکا تھا۔ گھر میں اُن کی جگہ نئے نوکر آ گئے تھے ۔
شروع شروع میں نریندر کرشنا کی محبت میں سرشار تھا۔ لیکن کچھ دن بعد اُسے معلوم ہوا ۔ یہ خوشی اور کیفیت مستقل نہیں عارضی ہے ۔ اُسے گھر کی ہر چیز میں شیاما کا معصوم اور حسین چہرہ دکھائی دیتا ۔ ہر آواز میں اُسے پاپا سنائی دیتا ۔

گھر سے کھچا کھچا اور بے دِل رہتے دیکھ کر کتنی ہی بار کرشنا نے پُوچھا۔ "یہ کیا رنگ ڈھنگ ہیں ؟"

نریندر مصنوعی ہنسی ہنس کر کہتا۔ "کچھ بھی نہیں۔ اچھّا تو ہوں۔"

کرشنا کہتی۔ " وُہ جوش وخروش جو شادی سے پہلے تھا۔ اب کہاں ہے ؟ یا سمجھ گئے کہ اب میں آپ کی غلام بن گئی۔ اور میری ساری زندگی اِسی غلامی میں گزر جائے گی۔"

نریندر کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اُس کی ٹھوڑی کو دبا کر کہتا۔ "تم بڑی فلاسفر ہو۔ دراصل فلاسفروں کو ہلکے وہم کی بیماری ہوتی ہے۔"

دونوں زور سے ہنستے۔

نریندر ہر ماہ سکھُو کے گھر جاتا۔ جو دس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں تھا۔ وہ گاؤں سے باہر اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتا۔ اور کسی آنے جانے والے کے ذریعے سے سکھُو کو کہلا بھیجتا۔ سکھُو پہلے ہی اُس کا منتظر ہوتا۔ دوڑ کر آتا۔ اور اُس کے قدموں پر گر پڑتا۔

نریندر پوچھتا۔ "شیاما راضی ہے ؟"

سکھُو کہتا۔ بہت راضی ہے سرکار۔ "کہو تو بُلا لاؤں۔"

نریندر جلد جلد کہتا۔ "نہیں۔ بُلانا نہیں۔ میرا مطلب ہے اب تو نہیں روتی۔"

سکھو مُسکرا کر کہتا۔ "نہیں سرکار۔ بالکل نہیں روتی۔ لیکن اب ہمیں کب بُلائیں گے آپ؟ اب تو گھر کو دیکھنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ چلا ہی آؤں اور اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ سرکار کیسے ہیں۔ رانی کیسی ہیں۔ گھر کیا ہے۔ کیونکہ چلتا ہے۔ لیکن سوگند قدم روک لیتی ہے۔ ہاں سرکار!"

نریندر سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہتا۔ "خبردار! چلے نہ آنا۔ ہاں جب میں بُلا بھیجوں۔ اس وقت۔"

سکھو پوچھتا۔ "کب تک بچّی کو ٹالتا رہوں۔ وہ کبھی کبھی پوچھتی ہے۔ "بابا گاؤں سے کب لوٹیں گے۔ وہ میرے لئے کیا لائیں گے کیسے آئیں گے۔"

نریندر کہتا۔ "تم کیا کہتے ہو اُسے؟"

سکھو ہنستے ہوئے کہتا۔ "سرکار صاف ٹال دیتا ہوں۔ کہتا ہوں وہ ہاتھی پر چڑھ کر آئیں گے۔ ہمارے تمہارے لئے بھینس لائیں گے۔ بکری لائیں گے۔ رانی لائیں گے۔ اور بندر کا چھوٹا سا بچّہ بھی۔ پھر دونوں گھر جائیں گے۔ مزے کریں گے۔"

نریندر سکھو کی باتیں سُن کر اندر ہی اندر پگھل جاتا۔ اُس کا رواں رواں رو اُٹھتا۔ وہ اِس سے زیادہ کچھ نہ پوچھ سکتا۔ لیکن سکھو کہتا۔ "آپ تو خوش ہیں اب!"

نریندر اِس کا کوئی جواب نہ دیتا۔ دیتا بھی کیا۔ اپنی دُنیا اُجاڑ

کر وُہ خوش کیسے رہ سکتا تھا۔ وُہ جیب سے پندرہ روپے کے نوٹ
نکال کر اُس کے آگے رکھتا۔ یا کبھی ریشمی فراک یا سلمہ ستارہ والی ٹوپی۔
اور پھر کہتا "میں وہاں کنارے کھڑا ہو جاؤں گا۔ تم شیاما کو لے آنا۔
اور واپس لے جانا۔ میں صرف دُور سے اُسے دیکھوں گا۔ تم اُسے
میرے متعلق کچھ نہ کہنا۔"

سکھو ہانپتا کانپتا گھر چلا جاتا۔ اور ہاتھ سے پکڑ کر شیاما کو لے
آتا۔ دُور کھیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا "وُہ دیکھو راج ہنس
ندی میں نہا رہے ہیں۔"

شیاما راج ہنسوں کو ڈھونڈنے میں لگی رہتی۔ اور کبھو مُڑ مُڑ
کر اپنے مالک کو دیکھتا۔ اُس وقت نریندر کی حالت قابلِ رحم ہوتی۔
وُہ چاہتا کہ دوڑ کر شیاما سے لپٹ جائے۔ اور ساری رات اُسے
اپنے سینے سے لگائے رکھے۔ دو چار قدم وُہ اُس کی طرف بے اختیار
ہو کر آ بھی جاتا۔ لیکن پھر رُک جاتا۔ دِل اور ہونٹ کانپنے لگتے۔
جب سکھو اُس کی یہ حالت دیکھتا تو شیاما کو گود میں اُٹھا کر آسمان
کی طرف متوجہ کرتا۔ کہتا "وہ دیکھو اُڑ گئے راج ہنس!"
آسمان کی طرف متوجہ کر کے ہی اُسے واپس گھر لے جاتا۔

نریندر بھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا چلا جاتا۔ جب تک
گاڑی اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔ وہ مُڑ مُڑ کر دیکھتا۔
اور قدم قدم پہ رُک جاتا۔ کہ کہیں سکھو نے شیاما کو میرے متعلق

نہ کہہ دیا ہو۔ اور وہ پیچھے سے "پاپا پاپا" کہتی ہوئی دوڑ کر نہ آ رہی ہو۔

گھر پہنچ کر بھی اُس کی اُداسی نہ جاتی۔ باہر سے آہٹ سُنتا۔ تو جھٹ دروازے پر آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اندھیرے میں ٹارچ روشن کر کے پھاٹک تک دیکھ آتا۔

(۶)

چھ سال گزر گئے۔

نریندر کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اگرچہ اُسے اولاد کی تمنا نہ تھی لیکن عام طور پر رنڈوؤں سے بیاہی ہوئی عورتوں کی طرح کرشنا بچے کے لئے ترس رہی تھی۔ اور رات دن اسی غم میں گھلی جاتی تھی۔ اُسے جہاں کہیں فقیر دکھائی دیتا۔ اُس سے تعویذ لیتی۔ حکیموں اور ڈاکٹروں سے دوائیں منگاتی۔ مندروں خانقاہوں میں منتیں مانتی۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نریندر ابھی کام پر سے نہ آیا تھا۔ کرشنا دروازے پر کھڑی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔

پھاٹک پر ایک بوڑھا گٹھڑی لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ کرشنا کو اُس کی حرکات پر شبہ ہوا۔ دراصل بوڑھا گھور گھور کر اندر دیکھ رہا تھا۔ اور اندر جانے کا فیصلہ اپنے دل سے کر رہا تھا۔

کرشنا نے پکار کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

وُہ ایسے بُوڑھوں کو اِس نیت سے ضرور پُوچھتی، کہ کِسی کے پاس اولاد کی دوا نہ ہو۔

بُوڑھے نے پھاٹک کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "سرکار آ گئے کیا؟"

کرشنا نے کہا۔ "ابھی نہیں۔ تمہیں کیا کام ہے اُن سے؟"

بُوڑھے نے مُسکرا کر کہا۔ "کام کوئی نہیں۔ اُن سے محبّت ہے۔ مَیں نے کافی مدّت اُنہیں گود میں کِھلایا ہے۔ اور اُن کا نمک کھایا ہے۔"

کرشنا نے حیرانی سے کہا۔ "اوہ۔ اندر آؤ۔ ابھی آتے ہونگے اُنہیں لانے کے لئے شوفر کار لے کر چلا گیا ہے۔"

بُوڑھا اندر چلا آیا۔ دروازے پر پہنچ کر کرشنا نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے۔ سرکار بہت اُداس رہتے ہیں۔"

دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے تھے۔ بُوڑھے نے تعجّب سے پُوچھا۔ "کیوں بھلا؟"

کرشنا نے مُسکرا کر کہا۔ "تم سے چُھپانا کیا۔ تم تو بزرگ ہو۔ میاں بیوی کو شادی کے بعد جس چیز کی تمنّا رہتی ہے۔ اُنہیں وہ نہیں۔ سمجھ گئے میری بات؟"

بُوڑھا چُپ ہو گیا۔ فرش پر ٹکٹکی باندھے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا۔ "سمجھ گیا رانی!"

کرشنا نے بے تابی سے پوچھا۔ "تمہارے پاس اُس کا کوئی عِلاج نہیں؟ بعض اوقات تو تم لوگوں کے پاس خُدائی ہوتی ہے۔"

بُوڑھے نے اپنے داہنی طرف رکھی ہو گٹھڑی کو زور سے دبا کر رکھا اور مایوسانہ انداز میں کہا۔ "نہیں سرکار۔ میَں غریب آدمی ہوُں۔ دوا دارُو کیا جانوں۔ یہ چیزیں ایشور کے ہاتھ میں ہیں۔ کِسی کو اولاد دے کر چھین لیتا ہے۔ اور کِسی کو اِس کے لئے ترساتا ہے۔"

بُوڑھے کے جواب سے کرشنا اپنے دِل میں شرمندہ ہوگئی۔ بات کو ٹالنے کے بہانے سے بولی۔ "اِس گٹھڑی میں کیا ہے۔ کوئی تحفہ اپنے سرکار کے لئے؟"

بُوڑھے نے حسرت آلود نگاہوں سے گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ اور پھر کرشنا کی طرف!

کرشنا نے دوبارہ مُسکرا کر پُوچھا۔ "کیا ہے اِس میں؟"

بُوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ "کپڑے۔"

کرشنا زور سے ہنس پڑی۔ بولی۔ "اوہ۔ میَں سمجھی کوئی تحفہ لیکن کِس کے کپڑے؟ اپنے؟"

بوڑھے نے دوبارہ گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ اور رُک رُک کر کہا۔ "شیاما کے۔"

کرشنا اب کی بار حیران رہ گئی۔ بولی "تم کیسی باتیں کہتے ہو؟ کس شیاما کے؟"

بُوڑھا پہلے چُپ رہا۔ جب کرشنا زیادہ بے تاب ہو کر اُس کے نزدیک آگئی۔ تو اُس نے کہا۔ "تمہاری بیٹی کے!"

کرشنا کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اُس نے پھر حیرت سے پُوچھا۔ "میری بیٹی کے ـــ میری ـــ"

بوڑھا فوراً کھڑا ہو گیا۔ جیب سے جلد جلد پندرہ روپے کے نوٹ نکالے۔ اُنہیں گٹھڑی پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ نرنیدر سرکار کو دے دینا۔ اور کہہ دینا۔ شیاما کل مر گئی۔ یہ اُسی کے کپڑے ہیں۔ سکھو واپس دے کر چلا گیا۔"

کہتے کہتے اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہو گئیں۔ اپنے نحیف بائیں ہاتھ سے آنسو پُونچھتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہُوا اور مُڑ مُڑ کر اپنے مالک کے گھر کو دیکھتا ہُوا پھاٹک سے باہر نکلا۔ اور کرشنا بُت کی طرح دُور تک اُسے دیکھتی رہی +
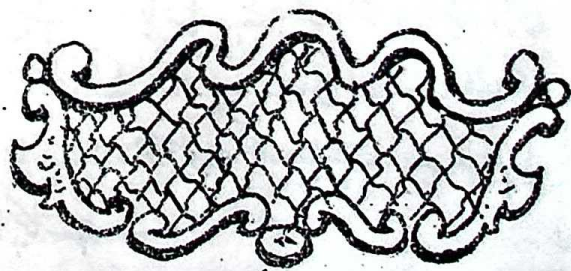
دُنیا ہماری

کل بنک کے چوک میں، غلام رسول کی لانڈری کے قریب میری مایوس آنکھوں نے دُنیا کی کئی تصویریں دیکھیں۔ ایک سے ایک حسین، ایک سے ایک جُدا، ایک سے ایک مختلف۔

دو لڑکیاں فرکوٹ کی دُھلائی کے متعلق غلام رسول سے باتیں کر رہی تھیں۔ "دیکھنا کہیں فر خراب نہ ہو جائے۔"

"ڈرائی کلیننگ سے بالوں کی سپیدی پر کوئی اثر نہ پڑے۔"

اور غلام رسول للچائی ہوئی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں کو جن میں سے ایک کے شباب پر معصومیت اور شوخی، شعریت اور بے نیازی چھائی ہوئی تھی۔ اور دُوسری کے شباب پر سنجیدہ سوختگی اور متانت، بے زاری اور یاس! دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں۔ ایک جیسے خد و خال، ایک جیسے نقش و نگار، ایک جیسی وضع قطع۔

صرف شباب کی شراب میں ایک زیادہ مخمور تھی اور دوسری کا خمار اُتار پر تھا۔ شاید ایک زندگی کے اُس موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں سے رنگین دُنیا شروع ہوتی ہے اور دوسری ــــــ وُہ کچھ فاصلہ طے کر چکی تھی۔ ایک ضرورت سے زیادہ خوش تھی اور دوسری ضرورت سے زیادہ سنجیدہ! شاید اُس کا شباب خراج حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

"کب تیار ہوگا کوٹ؟" کھلنڈری جوانی کی مالک نے اپنی آنکھوں کو ایک عجیب انداز میں گھماتے ہوئے پُوچھا۔

"بس پرسوں ــــــ پرسوں مس صاحبہ! میرا وعدہ پکّا ہوتا ہے" غلام رسول نے جلد جلد کہا۔

پکّے کے لفظ پر دونوں لڑکیاں ہنس پڑیں۔ شاید اُنہیں اعتبار نہ آیا کہ کوئی کشمیری بھی اپنے وعدے کا پکّا ہوتا ہے۔ اور غلام رسول۔ ایک معمولی لانڈری کا مالک، جو شروع شروع میں امیر اکدل کے امیروں کے کپڑے دھوتا تھا اور عام محنتی دھوبیوں کی طرح کمر پر گٹھڑی اُٹھائے پھرتا تھا۔ وُہ وعدے کا پکّا کیونکر ہو سکتا ہے؟ وہ وعدے کا پکّا ہوتا تو آج لانڈری کا مالک نہ ہوتا۔ عام جذباتی دھوبی ہوتا۔ گاہکوں کے سفید کپڑے پہنے ہوئے اُجلا اُجلا سا دکھائی دینے والا۔ لیکن زندگی نام ہے جدوجہد کا۔ شاید اِسی لئے وُہ دھوبی سے لانڈری کا مالک بن گیا! نہ جانے جدوجہد کا دُوسرا قدم اُسے کہاں پہنچا دے۔ سردست

وُہ اپنی زندگی کا ایک حسین خواب دیکھ رہا ہے۔ جہاں چوک میں لانڈری ہے۔ اور لانڈری کے برآمدے میں دو حسین و جمیل لڑکیاں ایک زندگی کے رومانی موڑ پر پہنچی ہوئی۔ دوسری مُڑ مُڑ کر طے کئے ہوئے فاصلے کو حسرت سے دیکھتی ہوئی۔

غلام رسول بار بار اپنے سیاہ اور حریص ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے۔ صرف اِس لئے کہ ذرا قابو میں رہیں۔ اور سنہرا سپنا دراز سے دراز تر ہو جائے۔ لیکن اندر کا سانپ اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ اُس کے روئیں روئیں سے باہر جھانک رہا ہے۔ مدھور شہنائی پر جو دو لڑکیوں کے شباب اور حُسن سے سرشار ناچ رہی ہے۔ کتنا فریب خوردہ ہے۔ حسین نظروں کے رقص پر، حسین قہقہوں کے نغمے پر لہرا رہا ہے۔ حالانکہ اُسے علم ہے کہ یہ سارا یہ ترنم اور یہ ہوش ربا نغمہ اُس کی رسائی سے کہیں دور ہے لیکن پھر بھی جھُوم رہا ہے۔ اگر بے زبانوں نے بھی آدم کے بیٹے کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہوتی۔ تہذیبیں بنا بنا کر مٹائی ہوتیں۔ تو شاید اندر کا سانپ اِتنا فریب خوردہ نہ ہوتا۔ وُہ آدم اور حوّا کی پیدائش سے فریب کھاتا آرہا ہے۔ فریب کھاتا جارہا ہے۔ اور شاید آئندہ بھی فریب کھاتا ہی جائے گا۔ اُس کے نزدیک رسائی اور نارسائی کا سوال نہیں۔ اُسے حسن چاہیئے اور موسیقی۔ نغمہ چاہیئے اور ترنم! اور غلام رسول وعدے کا پکا ہے——!

ایک بھکارن ہاتھ پھیلا رہی ہے۔ اُس کا معصوم بچّہ باسی روٹی کا ٹکڑا کھا رہا ہے۔ غلام رسول کا سنہرا خواب ٹوٹ جاتا ہے۔

"خدا کے نام پہ ایک پیسہ!"

اگرچہ بھکارن کو معلوم نہیں۔ خدا کون ہے۔ کہاں ہے، کیسا ہے پھر بھی اُسی کا واسطہ دے کر وُہ لوگوں کے جذبات پر دستک دیتی ہے۔ نادیدہ کا واسطہ۔ بے پروا کا واسطہ۔ پردہ نشین کا واسطہ۔

"خدا کے نام پر ایک پیسہ!"

لیکن کیوں ری بھکارن۔ کہاں ہے تمہارا خدا؟ جوانیوں کے نام پر، حسن کے نام پر، شوخی کے نام پر، ترقی کے نام پر کیوں پیسہ نہیں مانگتی؟ ذلیل عورت! جبھی تو خاک چھانتی پھرتی ہے۔ کہ تجھے صرف جذبات سے کھیلنا آتا ہے۔ محسوسات سے نہیں۔

"دُور ہٹ! بے حیا نہیں دیکھتی کون کھڑی ہیں؟" غلام رسول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

بچّہ پھر بھی مطمئن ہے۔ ماں دھتکاری جا رہی ہے۔ اور بچّہ مزے سے روٹی کا ٹکڑا کھا رہا ہے۔ کیا ہُوا ——؟ کچھ بھی تو نہیں! جذبات سے کھیلنے والوں کا، نادیدہ کا واسطہ دینے والوں کا اندر کا سانپ زمانے کی لاٹھی نے مار دیا ہے۔ زندہ ہوتا تو شاید پھنکار اُٹھتا۔ ڈسنے کے لئے اپنی پتلی سی زبان باہر نکالتا۔ لیکن وُہ مر چکا ہے۔ مارا گیا ہے ہمیشہ کے لئے۔ اور اس کا کسی کو افسوس نہیں۔ نہ بھکارن کو، نہ

بچے کو۔ نہ حسین و جمیل لڑکیوں کو اور نہ غلام رسول کو۔

بھکارن نے آنکھیں پھیلا کر اپنے سامنے کھڑی ہوئی لڑکیوں کو دیکھا۔ ننگی باہیں، اُبھرے ہوئے سینے، بوجھل بوجھل سی نرگسی آنکھیں، مرمریں چہرے۔ بالوں کی لٹیں کھلی اور پریشان —— وہ اُنہیں دیکھ کر نہ مرعوب ہوئی نہ شرمسار!

"خدا کے نام پر ایک پیسہ!" اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ اور بچہ روٹی کا ٹکڑا ختم کر کے شوخ و شنگ لڑکی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

اُجلے اور چرچرے شلوار پر میلے ہاتھوں کے نشان لگ گئے۔

"دُور —— دُور ہو جا ——" لڑکی نے ڈر کر، سہم کر اور ذرا پھلانگ کر کہا۔ اور پھر تاسّف، غصّے اور حقارت بھری نظروں سے پہلے اپنی شلوار کو دیکھا۔ پھر اُس کم بخت بچّے کی طرف! جواب بھی مطمئن تھا۔ البتہ اُس کی ماں بے چین ہو اُٹھی تھی۔ اور بے چینی ہی میں اُس نے بچّے کے گال پر تھپڑ بھی دے مارا۔ "پیسہ مانگ اِن سے ——" ماں نے بچّے سے کہا۔

بچّے کو تھپڑ کا کوئی احساس باقی نہ رہا۔ کیا ہوا ——؟ کچھ بھی تو نہیں! اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ایک پیسہ —— مائی ——"

دونوں لڑکیاں اور غلام رسول کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ "مائی

کیسی بائی ؟"

شاید بچے کو علم نہ تھا کہ ہر عورت بھک منگے کی مائی نہیں ہوتی۔

اور اُس کی ماں التجا بھری نظروں سے سب کو دیکھتی رہی ۔ خصوصاً اُن دو لڑکیوں کو۔ جن کے ہونٹوں پہ اُفق اور شفق کھیل رہی تھی۔

بھکارن کیا دیکھ رہی ہے؟ اپنی ہی ذات، اپنی ہی نسائیت کا ہی عکس دیکھ رہی ہے۔ ایک بہتا ہوا سا، ایک تشتر سا، ایک یگانگت سی، جو حوا نے دودھ کے ساتھ اپنی اولاد کو بخش دی تھی — بے وقوف عورت! حوا کو کیا معلوم تھا جب ننگے آدم کی اولاد غاروں سے نکل کر شہروں میں بسے گی۔ سماج بنائے گی۔ تہذیب کی طرح ڈالے گی۔ تجارت کرے گی۔ اس وقت وہ مقدس امانت جو تمہارے خیال کے مطابق سینہ بہ سینہ چلی آنی چاہیئے تھی۔ ختم ہو جائے گی + اور ایک ہی زمین پر رہنے والے آدم کے بیٹے کئی لکیریں کھینچیں گے۔ کچھ سیدھی۔ کچھ ٹیڑھی۔ کچھ متوازی اور کچھ ناقابل فہم سی! ایک لکیر کی قید میں بھک منگے ہوں گے۔ اور دوسری لکیر کی قید میں شوخ و شنگ لڑکیاں۔ تیسری لکیر میں غلام رسول۔ چوتھی لکیر میں غلام رسول کا ہمسایہ دکان دار۔ اور علیٰ ہذا القیاس۔ نہ کہ ہے حوا ہے نہ آدم! غریب پاگل ہو کر سمندر کی گہرائیوں میں ناچتے!

جا بے وقوف عورت! کیا دیکھ رہی ہے تو؟ کیسے پہچان رہی ہے تو؟ —— جا جذبات سے کھیل اور بھیک مانگ!

لڑکیاں چلی گئیں۔ نغمہ ختم ہوگیا۔ اور غلام رسول کے اندر کا سانپ اپنے بل میں جانے لگا۔ بھکارن اُسی طرح کھڑی دیکھتی رہی کہ کوئی لکیر پھاند کر اُس کی جھولی بھر دے۔ لیکن کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟

بھکارن نہ زیادہ خوبصورت تھی نہ زیادہ بدصورت۔ بس خوبصورتی اور بدصورتی کو آپس میں ملا دینے والی حد پہ کھڑی تھی۔ عمر بھی یہی تیس پینتیس کی تھی۔ بھیک نے اُس کا نسوانی غرور چھین لیا تھا۔ اب صرف التجا بن کر رہ گئی تھی۔ دودھ کے اُس پیالے کی طرح پرسکون؛ جس نے اپنی گرمی اور شیرینی کھو دی ہو۔

غلام رسول جب فرکوٹ کو کھونٹی پہ لٹکا کے باہر نکلا۔ تو بھکارن اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس نے پھر اپنی زبان حریص ہونٹوں پہ پھیرنا چاہی۔ لیکن کیوں؟ اب حرص کو قابو میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ سانپ پھر لہرانے لگا۔ لیکن ہولے ہولے —— ایک پھن پھیلائے ہوئے کوبرا کی طرح!

"ایک بات مانو گی ——؟" غلام رسول نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"کہہ دو ــــ"

(ہنس کر) "میرا مطلب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم رات کو کہاں رہتی ہو ؟"

"یہیں پار ــــ مسجد کے تھڑے پر ۔"

"ــــ تو آج رات ــــ یہاں نہ رہ سکو گی ــــ میری لانڈری میں ۔"

بھکارن کا چہرہ انگارے کی طرح سُرخ ہو گیا ۔

غلام رسُول اُس کے سامنے وحشیانہ قہقہے لگانے لگا ۔

بھکارن نے بچے کو اُنگلی سے تھاما ۔ اور اُسی طرح اُسی جوش میں برآمدے سے نیچے اُتری ۔

"حرامزادی ــــ چڑیل ــــ" غلام رسُول نے قہقہہ لگا کر مُڑ کر جانے والی بھکارن سے کہا ۔

بھکارن نے خاموشی میں گالی کھائی ۔ اُس کا سانپ زندہ ہوتا ۔ تو شاید وہ بھی لہرا اُٹھتا ۔ البتہ اُس کی طبیعت ملول ہو گئی ۔ کیوں ؟ گالی کیا بُری ہے ؟ اور بچے کی بھیک مانگنے والی ماں ــــ لوٹ آ ــــ تم جیسی لکیر کا ایک قیدی تمہاری جھولی بھر دے گا ــــ آ ــــ آج کی رات اُس کی لانڈری میں بسر کر ! اور پھر صبح چلی جا اِس وسیع دُنیا میں ، بے پروا خدائی کا واسطہ دیتے ہوئے !

آ ــــ بے وقوف بھکارن ۔ سانپ لہرا رہا ہے !

لیکن ناسمجھ بھکارن چلی گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں —— ہوا کی لہروں نے نہ جانے گالی کو کہاں دے پٹکا۔ ہنگامہ ہوتا۔ تو غلام رسول کا ہمسایہ دکاندار پتلون میں ہاتھ ڈالے باہر نہ نکلتا۔

غلام رسول قہقہے لگا کر۔ بھکارن کو سیٹیوں سے بلا کر جب نا اُمید ہو گیا۔ تو شکستہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اور سامنے سے دو موٹے موٹے انسان اپنے سرمایہ کے نفع و نقصان کا اندازہ لگاتے لگاتے گزرے۔

"کاش یہ جنگ دو سال تک ابھی بند نہ ہوتی ——" ایک نے کہا۔ اور دوسرے نے قہقہہ لگایا۔ پھر دونوں سامنے بنک میں داخل ہو گئے۔

کیا یہی ہے دنیا ہماری؟ اور یہی ہے اس کا اصول؟ سانپوں کو لہراؤ۔ گالیاں کھاؤ۔ حساب و کتاب رکھو۔ ٹکراؤ۔ لیکن چلے چلو! چلے چلو!!

اصول کی دنیا

(۱)
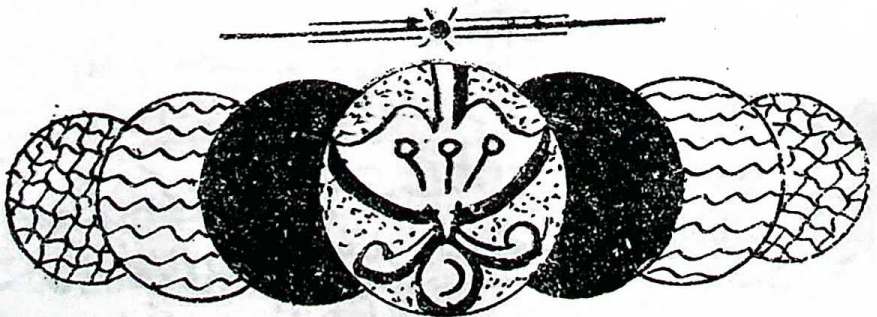
بینک کا کوئی ملازم رادھاکشن سے مطمئن نہ تھا۔ سب اُسے خبطی متکبر اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے۔ حالانکہ حقیقت اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ نہ خبطی تھا نہ متکبر بلکہ حلیم طبع اور خاموش نوجوان ہاں یہ ضرور تھا۔ کہ بینک کے اور ملازموں کی طرح نہ وہ فضول باتیں کرتا تھا اور نہ دوسروں کی عیب جوئی۔ دس بجے صبح سے چار بجے شام تک اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔ اس کے سامنے سے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن وہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ اس کے ہمدوش فرصت کے لمحوں میں ایک دوسرے نیز بینک میں آنے والوں پر وہ پھبتیاں اُڑاتے تھے کہ بعض اوقات رادھاکشن کو بھی نادل نخواستہ ہنسنا پڑتا تھا۔

رادھا کشن کی زندگی کا جو مقصد تھا۔ اور جس اصول پر وہ زندگی بھر چلنا چاہتا تھا۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ لیکن کم مایہ کلرک ہونے کے سبب بجائے اس کے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ اس پہ سو سو نام دھرے جاتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک تنگ دست کے لئے کسی پاکیزہ اصول پہ قائم رہنا کس قدر دشوار ہے لیکن اس نے نیک نیتی، پاکبازی، راست گوئی اور منکسر المزاجی کو مشعلِ راہ بنا لیا تھا۔ اور اسی مشعل کی روشنی میں زندگی کی تاریک راہوں سے گزرنے کی ٹھان لی تھی۔

گھر میں بھی رادھا کشن کو وہ سکون حاصل نہ تھا۔ جو ایسی عمر میں اُسے حاصل ہونا چاہیئے تھا۔ نہ جانے کس کی دعا سے ایشور نے اس کا گھر بچوں سے بھر دیا تھا۔ اس کی بیوی کی کوکھ سے جو بچہ پیدا ہوا زندہ رہا۔ ورنہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ بچے پیدا تو ہوتے ہیں لیکن جلد ہی مر بھی جاتے ہیں۔ ایسی اموات امیروں کے لئے باعث الم ہوں تو ہوں۔ تنگ دستوں کے لئے ہمیشہ موجب برکات ہوتی ہیں۔ دونوں قسم کے والدین رو دیتے ہیں۔ چھاتیاں پیٹتے ہیں۔ بال نوچتے ہیں۔ لیکن امیر کا ماتم اصلی ہوتا ہے۔ اور غریب کا مصنوعی۔ صرف اس آڑ میں کہ ماتم نہ کرنے پر اسے اپنی برادری قصائی نہ کہے۔

رادھا کشن کی بسر اوقات پینتیس روپے میں نہ ہوتی تھی۔ اور

دُوسری طرف قرض لینے کا وُہ عادی نہ تھا۔ وُہ اپنے اصُول کے اردگرد عزت کے ساتھ گھومنے کا متمنی تھا۔ خواہ اُس میں اُسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ یہی خواہش ہر کام شروع کرنے سے پہلے اُس کے پیش نظر رہتی تھی۔ اُس کی بیوی گھمبیر اور خوش مزاج تھی۔ لیکن تنگدستی نے اُسے کفایت شعار بنا دیا تھا۔ بٹی ہوئی محبّت میں بھی وُہ سب سے زیادہ سُکھی اپنے شوہر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جس میں صفات ہی صفات تھیں۔ عیب ایک نہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا شوہر کِس دشوار گذار راستے سے اپنی بیش قیمت زندگی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ شاکر تھی۔ صابر تھی۔ اور قانع تھی۔ کم خوراک تنگدستی اور بچوں کی کثرت نے اُس کا وُہ حسن چھین لیا تھا۔ جس پر جوانی کے دِنوں میں مرد ریجھ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وُہ ہر حال میں مطمئن تھی۔ اگرچہ مجبور رہی۔ جن بچّوں کو وُہ شاہزادوں کی طرح دیکھنا چاہتی تھی۔ اُنہی کو جب پیوند لگے ہوئے چیتھڑوں میں دیکھتی۔ تو ایک سرد آہ کھینچ کر رہ جاتی۔ اُس کی نگاہوں میں اُس کا شوہر نہیں بلکہ خود بچے بدنصیب تھے۔ جو لاڈ پیار اور خوراک کو ترسنے کے لئے اس کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی سمجھائی میں پڑنا ہی دینا ناٹھ رہتے تھے۔ عمر میں عماد ہاکشن سے بڑے نہ ہوں گے۔ لیکن قسمت میں دونوں کا مقابلہ ہی نہیں ایک کے پاس بے پناہ دولت اور دوسرا نوالے کا محتاج۔ اگر عقل اور لیاقت

پر خدا نے دولت تقسیم کی ہوتی۔ تو شاید دینا ناتھ گداگروں کی طرح کسی چوراہے میں بھیک مانگتا نظر آتا۔ لیکن خدا کے ہاں یہ قانون نہیں۔ وہ بِن دیکھے، بِن آزمائے کہیں فراخدل بن گیا ہے۔ اور کہیں جابر۔

کبھی کبھی پنڈت دینا ناتھ رادھاکشن سے ملتے۔ تو مسکرا کر پوچھتے "آپ اِس قدر کمزور کیوں ہیں؟" بنک میں زیادہ کام ہے کیا؟"

رادھاکشن مصنوعی ہنسی ہنس کر جواب دیتا "جی آجکل سیزن ختم ہو رہا ہے۔ سیاح حساب صاف کر کے جا رہے ہیں۔"

دینا ناتھ کہتے۔ "اِتنا کام ہوتے ہوئے بھی آپ اپنے سے بے پروا ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کام تو خوب کرتے ہیں لیکن کھاتے کم ہیں۔ ٹھیک ہے میرا قیاس؟"

رادھاکشن سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھتا۔ اپنی خودداری کو یوں پامال نہ ہوتے دیکھ کر کہتا "یہ بات نہیں صاحب! دراصل کچھ ایسا ہی ہوں۔"

دینا ناتھ زور سے ہنس کر چل دیتے۔ دولت نے اُس کی عزت ہر جگہ بنا رکھی تھی۔ سماج گویا اُس کا زرخرید غلام تھا۔ اُس کا احمقانہ شغل بھی جدت تصور ہوتا تھا۔ اُس کے مقابلے میں رادھاکشن صرف بنک کا کلرک تھا۔ ایک بے حقیقت اور بے مایہ کلرک۔ جو سماج کے نزدیک ایک بہتے ہوئے تنکے سے زیادہ وقعت نہ رکھتا

تھا۔ آخر اُس کی ذات سے سماج کو کیا فائدہ تھا۔ جو وہ اُسے سر آنکھوں پر جگہ دیتا۔ اُس کی لیاقت، اُس کا تدبر، اُس کا پاکیزہ اصول صرف بنک کی چار دیواری ہی میں ختم ہونے کے لئے تھا۔ اُس سے باہر نہیں۔ اور ایسے آدمی ، ورنایاب ہوتے ہوئے بھی سماج کے آگے ٹوٹے ہوئے کنکر سے زیادہ قیمتی نہیں ۔

(۲)

بڑے بیٹے کو نمونیا ہوگیا۔

رادھاکشن بسر اوقات کے لئے جتنا پُرزور جہاد کرتا جا رہا تھا۔ اُتنا ہی اُس کا دامن مصیبتوں کی خار دار جھاڑیوں سے اُلجھتا جاتا تھا۔ بنک میں اگرچہ وہ ایسے کام پر مامور تھا۔ جہاں تنخواہ کے علاوہ دو چار پیسے بھی کما سکتا۔ لیکن اُس نے کبھی اپنے من کو اُوپر کی آمدنی کے لئے میلا نہ ہونے دیا۔ شاید اِس وجہ سے بھی وہ بنک میں اتنا ہر دلعزیز نہ بنا۔ جتنا اُس کا پیشرو۔ جس نے اُسی کُرسی پر بیٹھ کر ہزاروں روپے کمائے تھے۔ عزت بنا رکھی تھی۔ اور ہر جگہ ساکھ بٹھا رکھی تھی۔

رادھاکشن کو مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹنے کے سبب اپنے کیریکٹر کی پاکیزگی میں شبہات سے پیدا ہونے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب اُن کے قدم زندگی میں پہلی بار ڈگمگانے لگے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ

جلنے والا دیا ہی اندر اور باہر سے میلا ہوتا ہے۔ اُسے کوئی پوچھتا نہیں۔ لیکن اِس کے باوجود اُس کے تو سیع نور کے اصول میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وُہ خاموشی سے سب کچھ سہہ کر روشنی پھیلاتا ہے۔ اور خود میل میں اٹا رہتا ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہو۔ کیریکٹر کی پاکیزگی کی کوئی قیمت تو ہونی چاہئے۔ اِنسانوں کے پاس اگر نہیں، نہ سہی۔ دیوتا تو اندھے نہیں۔ وُہ من کا بھید جانتے ہیں۔ کچھ نہیں دے سکتے۔ سکون اور فراغت تو بخش سکتے ہیں۔

لیکن اُس کا خیال ادھورا رہ جاتا۔ جب نظام قدرت کے دُوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالتا۔ شراب پینے والے، جُوا کھیلنے والے، غریبوں کا خُون چُوسنے والے، پیسوں کے عوض اپنی بہو بیٹیاں فروخت کرنے والے جب مزے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو کہاں ہیں من کا بھید جاننے والے دیوتا اور کہاں ہے اُن کا اِنصاف۔ اِکلوتے بیٹے کی بیماری سے پہلے تین دن کوئی گھبراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیوں؟

چوتھے دن بھی جب اُس کا بخار نہ ٹوٹا۔ تو بچّے کی ماں تلملا اُٹھی۔ ماتما کے دہکتے ہوئے شعلوں سے تنگدستی کی راکھ اُڑ گئی۔ مندر سے لایا ہُوا تلسی کا پانی، شوالے کا چرن امرت۔ بابا جی کے دُھوپ کی راکھ سب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اُس وقت تک رادھا کشن اپنے پاکیزہ اصُول کی دُنیا کو زور سے تھامے ہوئے تھا۔ لیکن جب بچّے

کی حالت خراب ہونے لگی۔ تو اُس کی مُٹھیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ صُول کی دُنیا لڑکھڑانے لگی۔

سراسیمگی میں بیوی سے بولا۔ "کہو تو کسی ڈاکٹر کو بُلاؤں۔"

بیوی نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی کہنا باقی ہے۔ نہیں دیکھتے گھر لُٹ رہا ہے۔"

رادھاکشن نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ہمّت رکھو۔ بچے اکثر بیمار بھی پڑتے ہیں۔ اور اُٹھتے بھی ہیں۔"

بیوی نے بیمار بچّے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہ خوش نصیبوں کے بچّے ہوتے ہیں۔ ہمارے بچّے ناگ ہوتے ہیں۔ ڈستے ہیں اور چل دیتے ہیں۔"

رادھاکشن اب کچھ نہ بول سکا۔ اُس کی جیب میں تنخواہ سے بچا ہُوا پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ بیٹے کا عِلاج کرانا اُسے بہت آسان دکھائی دیا۔ بولا۔ "تم فِکر نہ کرو۔ مَیں ہر قیمت پر علاج کرا دُوں گا۔ ہماری دنیا کے چاند تارے یہی بچّے ہیں۔ لیکن ——"

اِس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ آواز حلق میں رُک گئی۔ اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے اُمید ہے۔"

لیکن ڈاکٹروں کی اُمید ہر وقت اُمید ہی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر نے پھر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ آپ بچے سے بہت بے پروا رہے ہیں۔ جبھی یہ حالت ہو گئی ہے۔"

بچے کی ماں غمناک آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ نظروں ہی نظروں میں دونوں نے اپنی بے پروائی کا اندازہ لگایا۔ دونوں ایک دوسرے سے من ہی من میں پوچھتے تھے۔ "کیا ہم بے پروا ہیں؟"

ڈاکٹر ربڑ کی نالی سے ہزاروں مرض صرف دِل کی دھڑکن پہچان کر جان سکتے ہیں۔ لیکن دِل میں چھپی ہوئی بات کون سُن سکتا ہے؟ ڈاکٹر نے نسخہ لکھا۔ تو پانچ روپے کا نوٹ چٹکیوں میں اُڑ گیا۔ تین روپے میں بیرونی لیپ کی دوا آئی۔ اور دو روپے ڈاکٹر نے فیس میں لے لئے۔ پینے کی دوا بدستور باقی رہی۔ اب رادھا کشن کو معلوم ہو گیا کہ نمونیا کتنی خطرناک بیماری ہے۔ اور اُس کا علاج کرانا کتنا مشکل!

(۳)

بیمار کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ بخار ۱۰۵ درجے پر تھا۔ آج کی رات بحران ہونا تھا۔ رادھا کشن گھبرایا ہوا تھا۔ وہ آج بھی بنک میں چلا گیا۔ لیکن وہاں چین نہ آیا۔ بے شمار لوگ کونٹر کے آگے روپیوں کا اِنتظار کر رہے تھے۔ اور بابو کی بے پروائی

اور گراں خیزی پر حیران تھے۔ کچھ اُن میں ایسے بھی تھے۔ جو برملا کہتے تھے۔ "ایسے سُست ملازموں سے بنک کے نام پر بٹہ لگ سکتا ہے۔"

رادھاکشن کا قلم بڑے بڑے رجسٹروں پر چلتا تھا۔ لیکن اُس کا دل بیمار بیٹے کے بستر کا طواف کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کی باتیں گردن جھکائے چُپ چاپ سُن رہا تھا۔ آخر ایک بار اُس سے نہ رہا گیا۔ بولا "صاحب! گھر میں بچہ بیمار ہے۔ دل ہی نہیں لگتا۔"

ایک من چلے نے جو شاید کسی بیوپاری کا منیم تھا۔ کہا "خوب آدمی ہیں آپ بھی۔"

شام کو جب بنک بند ہونے والا تھا۔ پنڈت دینا ناتھ آ گئے۔ اور پندرہ سو کا چیک رادھاکشن کو دیتے ہوئے بولے۔ "ذرا جلدی کیجئے۔ میرا "وولف" چند دنوں سے بیمار ہے۔ اور ڈاکٹر کو لئے جا رہا ہوں۔"

رادھاکشن نے گردن اُوپر اُٹھائی۔ حیرانی سے پوچھا۔ "وولف؟"

دینا ناتھ نے مُسکرا کر کہا۔ "جی۔ ابھی ایک ہی مہینہ ہوا۔ ایک انگریز سے پانسو روپے میں خریدا ہے۔ کل سے دسہرہ کی چھٹیاں نہ ہوتیں۔ تو شاید روپے نکالنے کی ضرورت نہ پڑتی کون جانے وولف کے علاج پر کتنا کچھ خرچ ہو۔"

رادھاکشن ٹکٹکی باندھے حیرت کی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھا۔ ایک بڑے رجسٹر میں چیک کا اندراج کیا۔ اور پھر خزانچی سے نوٹوں کے کئی دلفریب بنڈل لے آیا اور دینا ناتھ کے آگے رکھ دیئے۔ دینا ناتھ نے نوٹوں کو گنا شمار کیا۔ جلد جلد اُٹھا کر جیب میں ڈال دیئے۔ اور چلے گئے۔ جلدی کی وجہ سے سو روپے کا ایک نوٹ وہ وہیں بھول گئے۔

رادھاکشن نے نوٹ دیکھا۔ تو اُس کے پیٹ کا پسینہ چھوٹ گیا۔ اتنی بڑی رقم دینا ناتھ کیسے بھول گئے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا۔ اُس نے چاہا۔ کہ دینا ناتھ کو واپس بُلا لیں۔ لیکن دینا ناتھ احاطے سے باہر چلے گئے تھے۔

رادھاکشن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر سوچا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ بنک کے قانون کے مطابق ایسی رقم ڈپازٹ میں درج ہونی چاہیئے تھی۔

رادھاکشن نے اپنے دِل میں سوچا۔ "جب وہ اِتنی بڑی رقم سے بے پرواہ ہیں۔ تو مجھے اُٹھانے میں کیا اعتراض ہے!"

لیکن پھر خیال آیا۔ "پرماتما کو کیا جواب دُوں گا۔ دینا ناتھ نے مجھ پر اعتبار کیا۔ اور نوٹ نہیں گنے۔ میں کیسے ——"

اُس نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بنک کے دوسرے مُلازم چلے گئے تھے۔ بوڑھا چوکیدار شیشے کی کھڑکیاں بند کر رہا تھا۔

اُس نے نظریں بچا کر نوٹ اپنی جیب میں رکھا۔ پاکیزہ اصولوں کی دُنیا دھڑام سے گر پڑی۔

آتی دفعہ وُہ بچّے کے لئے پریشان تھا۔ جاتی دفعہ اُسے بچّے کی پریشانی کے علاوہ ناقابلِ بیان افسوس تھا۔

جس وقت رادھاکشن گھر پہنچا۔ پنڈت دینا ناتھ کے ہاں ریڈیو بج رہا تھا۔ نہ جانے کس سٹیشن سے بچّوں کا پروگرام براڈکاسٹ ہو رہا تھا۔ کچھ بچّے ہنس رہے تھے۔ کچھ گا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ ساتھ پنڈت دینا ناتھ کے زور سے ہنسنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ شاید ڈاکٹر نے وولفسن کو دیکھ کر اُمید دلائی تھی۔

رادھاکشن نے اپنے کمرے میں قدم رکھا۔ تو بیوی نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "آج بچّہ بہت بے آرام ہے۔"

اپنی مٹھی میں زور سے سَو روپے کا نوٹ پکڑے ہوئے رادھاکشن نے کہا۔ "تم نہ گھبراؤ۔ سو روپے بھی اُٹھ جائیں۔ تو غم نہیں۔"

اُمید کے آنسو اُس کی بیوی کی آنکھوں سے پھُوٹ گئے۔ آج کتنے ہی دنوں کے بعد رادھاکشن نے اُسے دھیرج بندھائی تھی۔

رات کو بحران ہو گیا۔ بخار ٹوٹ کر ۹۵ سے نیچے گیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی معصوم رُوح بھی چلی گئی۔ بچّے کی ماں فرطِ غم سے بیہوش

ہو گئی - اور رادھا کرشن سرہانے مُردہ بچّے کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

محلّے والے جمع ہو گئے۔ سارا گھر ماتم سرا بن گیا۔ لیکن رادھا کرشن کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ ایک مستقل شکایت ایک ناتمام دردناک افسانہ۔ جسے سُنانے کے لئے وُہ کسی دردمند دِل رکھنے والے کی تلاش میں آوارہ تھا۔

(۴)

شمشان سے آکر وُہ سیدھا دینا ناتھ کے گھر چلا گیا۔ وُہ ابھی ابھی صُبح کا کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ رادھا کرشن کو دیکھ کر حیرت سے بولے ——"آپ ——"

رادھا کرشن کا دِل ٹوٹ چکا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جی"

اور پھر جیب سے سَو روپے کا نوٹ نکال کر اُس کے آگے رکھا اور کہا۔ "کل یہ نوٹ آپ بنک میں بھُول گئے تھے۔"

دینا ناتھ کے چہرے پر خوشی کی علامت ظاہر نہ ہوئی۔ اُس نے بے پروائی سے کہا۔ "اوہ۔ لیکن لوٹا دینے میں کیا جلدی تھی۔ رکھ لیا ہوتا۔"

رادھا کرشن کچھ کہے بغیر باہر چلا آیا۔ وُہ قدرت سے دو چیزوں

کا سودا نہ کر سکا تھا۔ جہاں دونوں ہیں گھاٹا ہی گھاٹا تھا۔ ایک سودا اُس کے حدِ اختیار سے باہر تھا۔ لیکن دوسرے پر اُسے قدرت تھی۔

اُجڑی ہوئی اصُول کی دُنیا دوبارہ بس گئی!
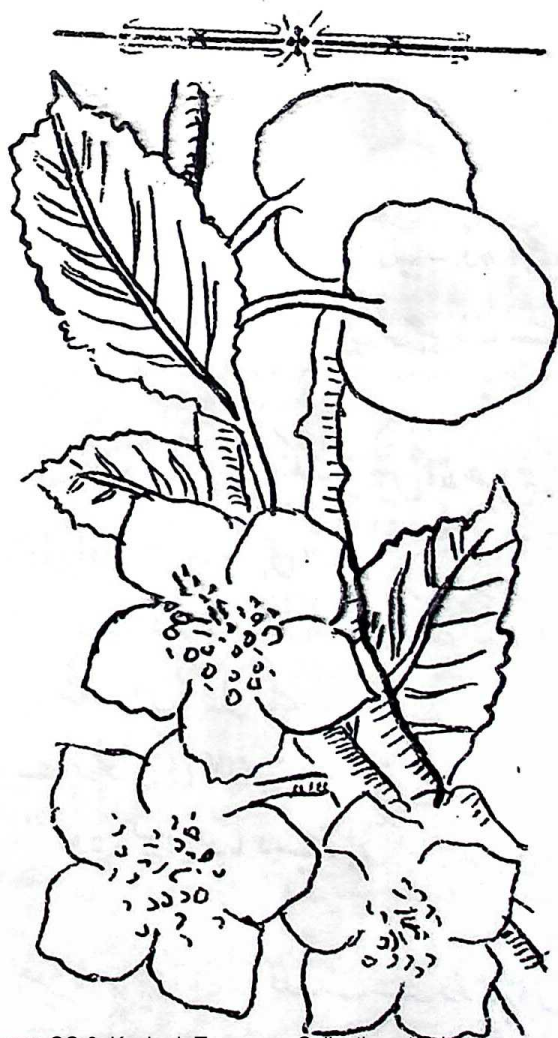
سایڈلائن

"بے وقوف!"

وہ میری طرف التجا بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔ میری بیوی بیمار ہے۔"

میرا جسم دفتر میں کام کرتے کرتے ٹوٹ گیا تھا۔ اور اسی ژولیدگی میں میرے دماغ نے نئے افسانے کے لئے کچھ تاثرات قبول کئے تھے۔ جو کچے دھاگے کی طرح کبھی ٹوٹ جاتے تھے اور کبھی جُڑ جاتے تھے۔

میں نے جل بھُن کر کہا۔ "آگ لگے تمہارے پیٹ کو! کوئی سایڈلائن کیوں نہ بنا رکھی۔ جو آج بھوکوں نہ مرتے۔"

بھوکا نوجوان میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ اور دُور

سنتے ہے کہ ملک میں تم مقبول ہو رہے ہو۔ شہرت کے اُونچے آسمان پر اُڑے جاتے ہو۔" فطرتی کمزوری کے غلبے سے میرا مُنہ بند ہو جاتا۔ دراصل افسانہ نویسی کا شوق میرے لئے سایڈ لائین تھی۔ ذریعہ معاش نہیں۔ کیونکہ میں بندوبست کا اسسٹنٹ ریکارڈ کیپر تھا۔

اور اُن کے دفتر کا چپڑاسی علیا صرف اِس لئے تنخواہ پاتا تھا کہ وُہ صرف چپڑاسی تھا۔ اُس کی کوئی سایڈ لائین نہ تھی۔ رات کو اگر وُہ گھر پر پلاڈی کے چھوٹے چھوٹے شکاروں پر پیر ماشی کرتا تھا۔ تو اُس سے وہ شہرت کے اُونچے آسمان پر نہ اُڑا جا رہا تھا۔ اور میں اُس کے برعکس مقبول تھا۔ مشہور تھا۔ اسسٹنٹ ریکارڈ کیپر بھی اور افسانہ نویس بھی! میں نے پھیلی ہوئی مسلوں کی طرف عاجزی سے دیکھا اور آنکھیں بند کر کے سر جھکا کر اُن سے کہہ دیا۔ "آج دیا کرو! میرے اَن داتاؤ ـــ آج دیا کرو! آج اپنی چھاتیوں میں مجھ ایسے بے رحم سے چھید نہ کرواؤ ـــ آج میرے دِل میں بوڑھے بھکاری کا تصور جسے میں نے دفتر سے آتے آتے چنار کے نیچے لیٹے دیکھا۔ چھید کر رہا ہے۔ آج اُسی کو چھیدنے دو ـــ میری چھاتی ـــ اور کل صبح ـــ "نئی صبح" کا علیا اُس چھید کا خون لے کر اپنے مالک کو دکھائے گا۔ وُہ خوش ہو گا ـــ اُس کے خریداروں کی تعداد بڑھ جائے گی اور میں شہرت کے اُونچے آسمان پر اُڑتا جاؤں گا۔"

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ کلاک کا پینڈولم سر ہلا ہلا کر کہہ

رہا تھا۔ "نہ چھیدو اپنی چھاتی ——— نہ بیچو اپنا خون ——— تباہ ہو جاؤ گے ———"

لیکن یہ بے جان پنڈولم، اِسے کیا معلوم! چھاتی میں خود چھید کرنا میری سائڈ لائن ہے۔ اور خُون بیچنا میری شہرت کا ذریعہ!

میری بیوی، میرے بچے شباب اور بچپن کے سپنے دیکھ رہے تھے اور شہتیر پہ سویا ہُوا جوڑا آزادی کے کیف اور خواب! اور بے جان پنڈولم۔ ٹِک ۔ ٹِک ۔ ٹِک . . . .

بے وقوف! اِن کی بھی کوئی سائڈ لائن ہوتی۔ تو کیا مزے سے یوں پڑے رہتے؟ میری طرح چھلنی نہ ہوئے ہوتے۔ کاغذ کے کُھلے پرزوں پہ اُن کا خُون نہ پھیلا ہُوا ہوتا۔ کیا بے کار زندگیاں گزر رہی ہیں۔ دراصل زندگی سائڈ لائن ہی کا نام ہے۔ جینا زندگی ہے۔ اور پیٹ کو تھامے مٹی چھپانا اِس کی پس پردہ سائڈ لائن! لیکن مجھے کیا؟"

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ اُس پتلے سے محافظ دفتر کی آنکھیں نوچ ڈالوں۔ بڑی بے رُخی سے کبھی کبھی کہتا ہے۔" یہ کہانیاں کیا ہیں؟ صاف دھوکا! تم لوگ حقیقت کو چھپا کر ہم پر زبردستی اُس کی نقل ٹھونس دیتے ہو اور توقع رکھتے ہو کہ ہم تمہیں سر آنکھوں پہ بٹھائیں۔"

کتنا بدمذاق شخص ہے۔ عمر کے چھیالیس سال بابو کاغذ کے پرزوں کو ٹھیک ٹھاک کرتے گزر گئے یا ناریل کا حقہ پیتے پیتے! اور اب مجھ سے افسانہ نگاری پر بحث کرتا ہے۔ اُلو کے پٹھے کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ دُنیا بذات خود دھوکا ہے۔ اُس کا اپنا وجود تک دھوکا ہے۔ ریٹائر ہو گا تو کتنے تک منہ تہ جیا ٹیں گے۔ اور آج حوصلہ افزائی کے برعکس میرے دِل میں افسانہ نگاری کی نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ گویا مَیں افسانہ افسانے کے لئے لکھتا ہوں کبھی کبھی حقے کے لمبے لمبے کش کھینچتا ہُوا کہتا ہے۔ "کاغذوں کے ساتھ دِل لگاؤ۔ انہیں سے تمہاری قسمت بنے گی۔ افسانوں سے نہ کسی کی قسمت بنی ہے نہ بنے گی۔ سب افسانہ نویس ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی مر گئے۔ کام کرو اور خوش رہو۔"

اس کے برخلاف دفتر کے سب چھوٹے بڑے ملازم میرے مداح ہیں۔ گلاب سنگھ چوکیدار تک میری کہانی پڑھ کر کبھی کبھی مجھے اُس کی داد دیتا ہے۔ حالانکہ وُہ چوکیدار ہے اور ادب سے کوسوں دُور! بابو ہیمراج اپنی نوکری کی بے ثباتی پر کہتا ہے۔ "تم بڑے خوش نصیب ہو۔ ایک لطیف آرٹ تمہارا غلام ہے۔ نوکری چھوڑ بھی دو گے تو مزے میں رہو گے۔ عزت بھی اور دولت بھی ——!"

صبح کے چار بجے کہانی ختم ہو گئی۔ دفتر میں کام کرنے کرنے میرا جسم ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ لیکن کہانی لکھتے وقت مجھ میں ناقابل یقین

قوت اور مسرت پیدا ہو جاتی ہے۔ جتنا خون سینچتا ہوں۔ اُس سے کئی گنا زیادہ عود کر آتا ہے۔ اور یہ کلاک کا پنڈولم کہتا ہے "تباہ ہو جاؤ گے۔"

صبح سویرے علیا آگیا۔ اُس کے ہونٹوں پر حسب دستور مسکراہٹ تھی۔ اور بغل میں اخباروں کا پلندہ!

مَیں نے کہا۔ "کہانی تیار ہے۔ ابھی لو گے یا خود دے آؤں؟"

علیا نے کہا۔ "مجھے دیجئے جناب! ایڈیٹر صاحب نے کہہ رکھا تھا۔ کہانی تیار ہو تو لے آنا —— اور کل ہمارا سنڈے ایڈیشن . . . . . ."

علیا کہانی لے کر چلا گیا۔ شوالے سے صبح کا گھڑیال بجنے لگا۔ میرے دماغ پر رات کا جو بوجھ تھا۔ وہ اُتر گیا۔ گھڑیال کے ٹن ٹن سے کتنی شانتی۔ کتنی تسکین اور کتنا سکون خلا میں پھیل رہا تھا۔

میری بشاشت مسامات سے پھوٹ پھوٹ رہی تھی۔ اور دوسرا افسانہ لکھنے تک میں سبک اور ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔

مَیں مسلوں کو بستے میں باندھ کر دفتر گیا۔ راستے میں کتنے ہی سر میری عقیدت میں جُھک گئے۔ کتنے ہی آدمیوں نے مجھے گذشتہ ہفتے کی کہانی کی داد دی۔ اور کتنے ہی نوجوان مجھے حیرت سے دیکھتے رہنے۔

"یہ ہے نگندر۔ نئی صُبح کا مشہُور افسانہ نویس!" وُہ ایک دُوسرے سے دبی زبان میں کہتے تھے۔ اَور اِن کی سرگوشیاں سُن کر میرا دماغ آسمان پر اُڑا جا رہا تھا۔ شاید میرے قدم بھی زمین پر نہ پڑتے تھے۔

(۲)

ایک دِن میں نئی صُبح کے دفتر میں گیا۔ ایڈیٹر نے مجھے دیکھتے ہی مجھ سے ہاتھ مِلایا۔ اَور سامنے کوچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اَور بولا۔ "آپ کی کہانی "سنگھم پر" بہت مقبُول ہوئی ہے۔ حالانکہ مجھے کہانیاں پڑھنے کا نہ شوق ہے نہ فرصت۔ لیکن میں نے بھی دو بار وُہ کہانی پڑھی۔ اَور حق تو یہ ہے کہ اس میں آپ نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ سچ مُچ غریبوں پر یہی کچھ ہوتا ہے آہاہاہا ـــــ کیا دلفریب کہانی تھی ـــــ ماسٹر جی تک اُسے پڑھ کر جھُومے۔ علیا کی آنکھوں میں بس آنسُو ہی پھُوٹ نکلے۔"

مَیں نے خشک سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "آپ کی نوازش ہے۔ ویسے تو کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ جب آدمی توجہ سے لکھے۔"

ایڈیٹر نے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "لیجئے!"

"شکریہ! مَیں سگریٹ نہیں پیتا۔" مَیں نے کہا۔

"پھر ہم آپ کی کیا خدمت کر سکیں۔ کچھ پھل منگوائیں؟" ایڈیٹر

نے گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

"مہربانی! نوازش —— مَیں کھانا کھا کر آیا ہُوں" مَیں نے جواب دیا۔

ایک کتاب کو ہاتھ میں اُٹھاتے ہوئے وُہ پھر بولے۔ "نگندر صاحب! اب آپ بھی اپنی کہانیوں کو کتابی صُورت میں چھپوائیں۔ یہ دیکھیئے کتنی دیدہ زیب کتاب بن گئی ہے۔ بالکل اسی نوع کی۔ میرا خیال ہے۔ ہاتھوں ہاتھ بِک جائے گی۔"

مَیں نے ایڈیٹر کے ہاتھ سے وُہ کتاب لے لی۔ سچ مچ اُس کی کتابت۔ طباعت۔ جلد بندی بہت دیدہ زیب تھی۔

ایڈیٹر نے پھر کہا۔ "آج کل لوگوں کی نگاہیں اندر کو نہیں دیکھتیں۔ اُوپر اُوپر دیکھتی ہیں۔ اِس کتاب میں اگرچہ کوئی خاص بات نہیں۔ پھر بھی خُوب بِک رہی ہے اور ماشا اللہ آپ کی چیزوں میں جان ہوتی ہے۔"

مَیں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے کیا اعتراض ہے۔ چھپوا دیجئے۔ کہانیاں میں اِنتخاب کر دُوں گا۔"

ایڈیٹر نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہماری تو وُہ لائن ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ کسی پبلشر سے بات چیت کیجئے۔ وُہ بھی فائدے میں رہے گا اور آپ بھی۔"

مَیں نے اُن کی طرف غور سے دیکھا۔ وُہ پنیتیں کے ہاتھی سے

کھیل رہے تھے اور شاید کسی چیز کے منتظر!

میں نے کہا۔ یہ دیکھا جائے گا۔ وقت پر سب کچھ ہو گا۔"

اُسی وقت علیا کاپی لے کر آگیا۔ جتنی دیر میں وہ کاپی پڑھتے رہے۔ میں اُس کلاک کی طرف دیکھتا رہا۔ جو اُن کے کمرے کی دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اِس کا پنڈولم بھی سر ہلا ہلا کر جیسے مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"وُہ تو ہماری لائن ہی نہیں ـــــ وہ تو ہماری لائن ہی نہیں۔ ہم خُون بیچتے ہیں ـــ اُسے اکٹھا نہیں کرتے ـــ کہ کوئی اُس سے اپنے لئے حرارت پیدا کر سکے ـــــ وُہ تو ہماری لائن ہی نہیں۔"

علیا کاپی پریس کے لئے لے گیا۔ تو میں نے کہا۔" ایک عرض ہے۔ بشرطیکہ قبول ہو۔"

" ارشاد ـــ ارشاد!" ایڈیٹر نے اپنی نوکیلی ٹوپی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اور میری طرف متوجہ ہُوا۔

" ہمارا محکمہ ٹوٹ رہا ہے۔ اِس کے متعلق اپنی دو چار اشاعتوں میں کچھ لکھئے۔" میں نے کہا۔

ایڈیٹر نے مُسکرا کر کہا۔" ٹوٹنے دیجئے ـــ آپ کو کیا؟"

میں نے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔" صاحب۔ کئی مُلازم بے خانماں ہو جائیں گے۔ اُن کا کیا بنے گا؟"

ایڈیٹر نے اُسی طرح مُسکراتے مُسکراتے کہا۔" سچ تو یہ ہے۔ آپ کا محکمہ مُلک کے خزانے پر خواہ مخواہ کا بوجھ ہے۔ کسانوں۔ مزدوروں

اَور تاجروں سے حاصل کیا ہوُا پیسہ اِس طرح بے مصرف خرچ ہو۔ اِس کی ہم کیسے حمایت کر سکیں گے؟ اَور آپ تو جانتے ہی ہیں۔ ہماری پالیسی حریت پروانہ ہے۔ اگر یہی پیسہ ملک کی کسی بہبود کے کام آئے تو کیا آپ خوش نہ ہوں گے ــــ یقیناً ہوں گے۔"

میری پیشانی سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ مجھے اپنا آپ بہت بوجھل محسُوس ہو رہا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "میری سروس ابھی پانچ سال کی بھی نہیں اَور مجھے ڈر ہے۔ ۔ ۔ ۔"

ایڈیٹر نے زور سے قہقہہ لگایا اَور کہا۔" واہ صاحب! آپ بھی حد کرتے ہیں۔ آپ کے ہزاروں مداح ہیں۔ اتنے اخبار ہیں۔ "نئی صُبح" ہے۔ آپ کو کیا ڈر؟ آپ کی سایڈ لائن آپ کو گرنے نہیں دے گی۔"

"سچ مچ میری سایڈ لائن بہت مضبوط ہے"۔ مَیں نے دل میں سوچا اَور نظریں پھر بنڈولم کی طرف اُٹھیں۔ جواب کہہ رہا تھا۔ "آپ کی سایڈ لائن آپ کو گرنے نہیں دے گی۔"

"سچ مچ ایسا محکمہ اڑنا ہی چاہیئے۔ جس میں بد مذاق محافظ دفتر ہو۔ گلاب سنگھ سا ہر وقت اونگھنے والا چوکیدار ہو۔ لیکن بابُو ہیمراج ۔ ٹھاکر دلیپ سنگھ۔ پنڈت دوار کا ناتھ ۔ ۔ ۔ وہ میرے مداح ۔ ۔ ۔ اُن کا کیا ہو گا؟" مَیں نے پھر سوچا۔

اُٹھتے اُٹھتے ایڈیٹر صاحب بولے۔" کوئی نئی چیز لکھی ہے آپ نے؟

میرا مطلب ہے کوئی ایسی چیز، جو "سنگھم پر" سے زیادہ خوبصورت ہو — زیادہ نفیس!"

میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "لکھی ہے۔ کل سے صاف کر رہا ہوں۔ شاید آج ختم ہو جائے۔"

جب میں سیڑھیاں اُترنے لگا۔ تو وہ بھوکا نوجوان سیاہ وردی میں ملبوس ایک کاپی لے کر پریس سے آ رہا تھا۔

میں نے قدم روک کر اُسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "دینو!"

دینو نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور کہا۔ "جی!"

"تم ملازم ہو گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

دینو نے سر جھکا کر کہا۔ "جی — مارگن پریس والوں کے پاس۔"

میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "بہت خوشی ہوئی مجھے — بہت خوشی — لیکن کیا تنخواہ دیتے ہیں؟"

دینو نے سیڑھی چڑھتے ہوئے کہا۔ "بارہ روپے!"

"اب بھوک تو مٹ گئی ہوگی تمہاری؟" میں نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے پوچھا۔

دینو میری طرف مڑ کر آہستہ سے مسکرا دیا۔ زبان سے کچھ بھی نہ بولا۔

ایک مہینے کے بعد اچانک وہ بخار ٹوٹ سا گیا۔ جو کئی مہینوں سے

چھوٹے بڑے ملازموں کو چڑھا تھا۔ محکمے کا نصف عملہ تخفیف میں آچکا تھا اور ان میں میں بھی۔ گلاب سنگھ بھی اور بابو ہیمراج بھی —— اور بھی کتنے ہی —— صرف وہ بدمذاق محافظ دفتر اور دو کلرک بچ گئے تھے۔

بابو ہیمراج میرے پاس آیا۔ اور ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ "اب کہاں جائیں نگندر۔"

میرا دل نہ زیادہ پشیمان تھا نہ زیادہ مسرور۔ مجھے اپنی سائیڈ لائین پر بھروسہ تھا۔ جس نے میرے لئے ہزاروں مداح پیدا کر دئے تھے۔

میں نے ہنس کر کہا۔ "تم جان کیوں ہارتے ہو؟ خدا کارساز ہے۔ بھوکوں تو نہیں مارے گا۔"

بابو ہیمراج نے لمبی آہ کھینچ کر کہا۔ "بھئی۔ تم تو افسانہ نویس ہو۔ اخبار میں سما سکو گے۔ لیکن ہم —— ہم کہاں جائیں؟"

میں نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "کاش! تم بھی افسانہ نگار ہوتے —— اوہ کتنی عظیم غلطی کی ہے تم نے! —— دن کو کلرکی کرتے اور رات کو افسانہ نویسی۔"

آرڈر پر سبکدوشی کا دستخط کر کے میں 'نئی صبح' کے دفتر میں آیا۔ راستے میں سوچتا رہا اب خوب افسانے لکھ سکوں گا۔ مطالعے میں بھی اضافہ ہوگا۔ کیا ہوا! پچیس روپے کی نوکری گئی۔ شہرت۔

عزّت اَور دَولت کا دروازہ تو کُھل گیا۔

ایڈیٹر نے مجھے دیکھتے ہی کہا:" بڑا افسوس ہے۔ آپ تخفیف کی زد میں آگئے۔ لیکن شکر ہے کہ مُلک کے پیسے کا ناجائز مصرف ختم ہُوا۔"

مَیں نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔" اَور اب ؟"

ایڈیٹر میرا مطلب تاڑ گئے۔ بولے۔" اب کیا ہے۔ اب تو آپ آزاد ہیں۔ اپنی سائیڈ لائن کو نہ گرنے دیجئے۔ اب افسانے لکھا کیجئے۔ دن اَور رات۔ اَور جب ہماری مالی حالت اجازت دے گی۔ ہم آپ کی کچھ مدد بھی کیا کریں گے۔ اِس کا اطمینان رکھیں۔"

میری پیٹھ پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ نتھنے زور زور سے دھڑکنے لگے۔

بڑی ہمّت سے مَیں نے پھر پُوچھا۔" اگر یہاں ہی کام کروں ـــــ تو۔"

ایڈیٹر نے مسکرا کر اَور پھر ساری ہمدردی کو لفظوں میں جمع کر کے کہا۔" افسوس ہے۔ ہمارے پاس اِس وقت گنجائش نہیں ـــــ"

میرے چہرے پر اوس پڑ گئی۔

میری آنکھوں سے آگئے۔ دینو ـــ گھر کے کلاک کا پنڈولم اَور بدمذاق محافظ دفتر پھر سے نے لگا۔

اور جب میں کمرے سے نکلنے لگا تو ایڈیٹر کے کلاک کا پنڈولم زور زور سے اپنا سر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔ "ہمارے پاس گنجائش نہیں ——— گنجائش نہیں !!"

(۱)

جنم اشٹمی کا تیوہار تھا۔ گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ کوئی فریم میں جڑی ہوئی بھگوان کرشن کی تصویر صاف کر رہا تھا۔ کوئی ٹھاکر دوارے میں پوجا کے برتن مانجھ رہا تھا۔ کوئی کلیاں چن رہا تھا۔ کوئی بیٹ پوجا کا انتظام کر رہا تھا۔ بچے تلے ہوئے آلو اور ترلوڑ کھانے کی خوشی میں سب کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا نظم مکمل کر رہا تھا۔ یہ نظم آج رات کو کشمیری پنڈتوں کے عظیم الشان جلسے میں جو ہر سال بھگوان کرشن کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ مجھے سنانی تھی۔ نظم قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ البتہ آخری بند پر طبیعت ایکا ایکی رک گئی تھی۔ بھگوان کرشن کا فلسفہ دل کا نیا ہے۔ اُن کے کارنامے، سب کا حال نظم میں آ گیا تھا۔ آخری

بنانے کے لیے جیسے کچھ سُوجھتا تھا۔ ہر اس میں لاانتہا سوز بے پناہ درد اور بے حد رنگینی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے کتنے ہی مصرعے موزوں کیے۔ لیکن میری طبیعت کو ایک بھی نہ جچا۔ سب پھیکے اور بے جان سے معلوم ہوئے۔

طبیعت کو ایک مرکز پر لانے کے لیے میں نے کیا کچھ نہ کیا۔ کمرے میں ٹہلا۔ کبھی پلنگ پر لیٹا۔ کبھی سگریٹ سلگایا لیکن پھر بھی رُوٹھی ہوئی طبیعت موزوں نہ ہوئی۔ ناچار اُس جھروکے میں آکر بیٹھا۔ جو جنوب مشرق کی طرف کھلتا ہے۔ میں نے دیکھا۔ مقابل کے خستہ مکان کے جھروکے میں ایک بہت حسین لڑکی سر جھکائے اداس بیٹھی ہے۔

یہ جنم اشٹمی کا دن تھا۔ نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں سسرال جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اُن کے کپڑوں کی خوشبو سے سارا محلہ مہک اُٹھتا تھا۔ مانگ کی سندور ننگے سروں پر مسکراتی تھی۔ اور ماتھے پر ساتت رنگوں کا تلک "تارے" کی طرح چمک رہا تھا۔ اِس دن اُداس بیٹھنا سال بھر کے لئے بدشگون مانا جاتا ہے۔ پھر یہ حسین لڑکی سر جھکائے کیوں بیٹھی ہے۔ اِس کی مانگ کا سندور کہاں ہے؟ اِس نے ابھی تک کپڑے کیوں نہیں بدلے۔ تلک کیوں نہیں لگایا۔ سسرال جانے کی خوشی میں جو ہندو استری کی

سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے یہ بھولی بھالی حسین لڑکی پاگل کیوں نہ ہو اُٹھی؟

مجھے معلوم تھا۔ اِس خستہ مکان میں جس کی دیواریں کچی اینٹوں کے سہارے کھڑی تھیں۔ سورج رام کی مختصر دُنیا آباد تھی۔ وُہ مدرسے میں چپڑاسی تھا۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے وُہ انسپکٹر صاحب مدارس کے دفتر کا جمعدار بن گیا۔ اب بھی کہ وُہ ترقی کی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کا وُہی رنگ ڈھنگ تھا۔ وہی جھکی ہوئی کمر۔ وہی پھٹی پھٹی سی آنکھیں۔ کاندھے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی۔ داڑھی پر بھورے رنگ کا وسمہ لگائے۔ میلی زین کا پھٹا ہُوا سرکاری کوٹ پہنے۔ سر پر خاکی پگڑی بے ترتیبی سے باندھے ہوئے جب کبھی مجھے گلی میں آتا جاتا دیکھتا تھا۔ تو بڑے پیار اور پریم سے آشیرواد دیتا تھا۔ کبھی کبھی میرے گیت سُنتا تھا۔ تو چھر وکے میں بیٹھے بیٹھے ہی جھوم اُٹھتا تھا۔ اور حقّہ پینا تک بھُول جاتا تھا۔ ہر صبح ٹھاکر دوارے میں پُوجا پاٹھ کرتا تھا۔ اُس کی آواز میں غضب کی کشش تھی۔ منتر اِس انداز میں پڑھتا۔ کہ لوہا بھی پگھل کر بہ جاتا۔ اپنی مختصر سی دُنیا میں بہت خوش تھا۔ لیکن عمر بھر صرف ایک ہی ارمان رہا۔ اِتنی منتیں مان کر اور جی توڑ کر بھی بھگوان نے اُسے لڑکا نہ دیا۔ ہاں لڑکیاں بہت دیں۔ لیکن اُن میں بھی صرف راجکی ہی زندہ رہی۔ باقی آگے پیچھے والدین کو داغِ مفارقت

دے کر چل بسیں۔

جن دِنوں، میں مدرسے میں پڑھتا تھا۔ جانکی مجھ سے بہت چھوٹی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سورج رام کی ساری عبادت کا نور اُس کے چہرے پہ نکھر گیا ہے۔ لڑکی کیا ہے سرسوتی کا اوتار ہے۔ جس گھر میں جائے گی۔ اُسے بقعہ نور بنائے گی۔ جانکی بڑی ہو کر بیاہی گئی۔ پرکھ پرکھ کر سورج رام نے بات طے کی۔ وہ اپنی عمر میں سُکھ اور مکمل سکون کا ایک دِن بھی نہ دیکھ سکے تھے۔ لیکن اپنی بیٹی کے لئے اُنہیں ایسے سمندر کی تلاش تھی۔ جہاں وُہ مسرتوں اور قہقہوں میں ایک روندے ہوئے حسین کنکر کی طرح ڈُوب جائے۔ جہاں اُس کی وُہ آرزوئیں پوری ہوں۔ جو اُس کے غریب والدین کے گھر میں پُوری نہ ہوئی تھیں۔ اِسی لئے اُنہوں نے ٹھنک بجا کر جانکی کا بیاہ کیا۔ قسمت کی یاوری سے گھرانہ بھی ایسا ملا۔ جہاں بھگوان نے سب کچھ دیا تھا۔ صرف کھانے والے نہ دیئے تھے۔ ساس اور سُسر کی ساری دُنیا اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جو حال ہی میں سرکاری نوکر بھی ہو گیا تھا۔ کشمیری پنڈت کو اپنی بیٹی کے لئے کچھ نہ ملے تو پروا نہیں۔ البتہ لڑکا سرکاری ملازم ہونا چاہیئے۔ یہی اُس کے اور اُس کی بیٹی کے لئے دولت لازوال ہے۔

جانکی سسرال گئی۔ تو ساس اور سُسر کی پلکیں اُس کا بچھونا ہو گئیں۔

میری نظروں کے سامنے اب تک وہ رنگین شام ہے۔ جب سُورج رام کے گھر جانکی کی برات آئی تھی۔ اُس دِن سُورج رام رنگل کا سفید پیرہن پہنے اور ململ کا صافہ باندھے کمر جھکائے ہوئے آرام کرسی پر بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اور آرزوؤں کو پُورا ہوتے دیکھ کر اندر ہی اندر ہی اُٹھتا تھا۔ آج وُہ چپڑاسی نہ دکھائی دیتا تھا۔ ماتھے پر سندور کے تلک سے مہرشی سا دکھائی دیتا تھا۔ محکمہ تعلیم کے چھوٹے بڑے افسر اپنے کہن سال چپڑاسی کی خدمات کو خراج عقیدت ادا کرنے کے لئے قطاروں میں کھڑے تھے۔ اور محلّے کا بچّہ بچّہ جان توڑ کر کام کر رہا تھا۔ وُہ بھی آج سُورج رام کی شفقت کا معاوضہ ادا کر رہے تھے۔

معاً میرے سامنے چادر بچھائی گئی۔ میرا حسین خواب ٹوٹ گیا۔ میری بیوی رکابی میں تلے ہوئے آلو اور کچھ پھل لے کر کھڑی تھی۔ مسکرا کر اُس نے پُوچھا۔ "بھوک تو نہیں لگی؟"

مَیں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ جسم اُٹھی اور بھوک! توبہ!"

بیوی نے حیرانی سے پُوچھا۔ "تو آپ کچھ نہ کھائیں گے؟"

مَیں نے کہا۔ "کھاؤں گا اگر کچھ ملے گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ سُورج رام کے مکان کے جھروکے میں بیٹھی ہوئی یہ لڑکی کون ہے؟"

بیوی نے چادر پر رکابی رکھ دی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اور پھر بولی۔ "آپ نہیں پہچانتے اِسے۔ جانکی نہیں کیا؟"

مَیں نے بے اختیار کہا۔ "اوہ۔ جانکی ہے؟ دو برس عمر

سے باہر رہ کر میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ جانکی! ہاں شکل وصورت تو وہی ہے۔"

بیوی نے آہستہ سے کہا۔ "اب اس کی شکل وصورت کا کیا، جب سہاگ ہی نہ رہا۔"

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا ہوا اسے؟"

بیوی نے کہا۔ "یہ تو بیاہ کے دو مہینے بعد ہی بدھوا ہو گئی۔ جو موتی سیپ سے نکلا تھا۔ وہ ٹوٹ چکا ہے نکلنے کے وقت موتی تھا۔ ٹوٹنے کے بعد وہ کانچ کا ٹکڑا۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔ سورج رام کی ساری دنیا قدرت کے ایک کرشمے سے خاکستر ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "بڑا غضب ہوا۔ بے چارہ سورج رام آخر عمر میں لُٹ گیا۔"

بیوی نے پھر کہا۔ "اب بے چاری جانکی کی ساس بھی مر گئی اور ماں بھی۔ نہ وہاں رہ سکتی ہے نہ یہاں۔ ساری دنیا میں اس کے لئے اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔"

اُسی وقت ایک بچے نے بھگوان کرشن کی صاف کی ہوئی تصویر میرے سامنے لا کر رکھی اور کہا۔ "اب ٹھیک ہو گئی مدھو بابو۔"

میں نے تصویر دیکھی۔ وہ مسکرا مسکرا کر اور جھوم جھوم کر

بانسری بجا رہے تھے۔ شاید اُس وقت جب اُنہوں نے انیلے پر فتح حاصل کی تھی۔

میرا دِل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ با دلِ ناخواستہ میں نے بچّے سے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہو گئی۔ لے جاؤ اب۔"

بیومی نے پُوچھا۔ "اور یہ پھل؟"

مَیں نے نظم پہ ٹکٹکی باندھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

"یہ بھی۔"

(۲)

میری نگاہوں میں جانکی کا مستقبل پھرنے لگا۔ بھولی بھالی حسین لڑکی جس نے ابھی دُنیا کی روشنی نہ دیکھی تھی۔ عمر بھر کے لئے لُٹ چکی تھی۔ شاید ابھی اُسے اِتنا بھی احساس نہ تھا کہ اُس کی زندگی کن ہیبت ناک تاریکیوں، دردناک فریادوں اور غمناک مصیبتوں سے بھر گئی تھی۔ وُہ ہندو سماج میں بدھوا کے لفظی اور عملی معنی سے بے خبر تھی۔ بُوڑھے باپ کی حیات تک کِسی حد تک وُہ اپنے سے بے پروا ہو سکتی تھی۔ لیکن اُس کے اُٹھ جانے کے بعد اُس کا کیا ہو گا؟ کون اُس کے شباب، اُس کی مستی۔ اور اُس کے حُسن کا محافظ ہو گا۔ اِنسان کا دِل کمزوریوں سے بھرا پڑا ہے۔ کیا عجب ہے باپ مرنے کے بعد جانکی کے معصوم دِل میں

کمزوری پیدا ہو۔ اور وُہ اپنی ساری تقدیس کو قُربان کر بیٹھے۔ بے چاری پر مصیبت ٹوٹنے کے وقت سب کے دِل اُس کے لئے ہمدردی سے بھر سے گئے ہونگے لیکن کسی نے اُس کے مستقبل کی خوفناک تصویر کا اندازہ نہ کیا ہوگا۔

ہمارے دھرم اور ایمان کا آورش کِتنا ہی بلند اور پاکیزہ کیوں نہ ہو۔ لیکن جب تک ہمارے سماج کے قوانین ہیں۔ ہم عورت ذات کے آگے سرنگوں ہیں۔ قانون ساز نے جہاں کچھ پایا۔ اُس نے وُہ مردوں کو دے دیا۔ عورت کو صِرف خوبصورت الفاظ میں ٹال دیا۔ یہ ہمارا ایمان ہی نہیں بلکہ ہم یہ محسوس بھی کرتے ہیں۔ اور چُپ رہنے کے سِوا چارہ ہی نہیں دیکھتے۔ اندر اندر سے زور دار الفاظ میں اِس کی دھجیاں بھی اُڑاتے ہیں۔ تنقیدیں بھی کرتے ہیں۔ مخالفت پر بھی اُتر آتے ہیں۔ لیکن جب عملی ثبوت کا موقعہ آتا ہے۔ تو جان بچا کر بھاگ جاتے ہیں۔ صرف اِس خوف سے کہ برادری میں ہمارے نام پر حرف نہ آئے۔ اور ہم بدستور سعادت مندوں اور مریدوں میں شمار ہوتے رہیں۔ لیکن کیا دُنیا میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی بُزدلی ہے؟

ہمارے قوانین ناقص ہیں۔ رُسوم تباہ کُن ہیں۔ اِن کی بدولت ہم آئے دِن قعرِ پستی میں گرتے جاتے ہیں لیکن بھیڑوں

کی طرح سر نہیں اُٹھا سکتے۔ ایک معصوم لڑکی کا سب کچھ ہمارے سامنے لُٹ جاتا ہے۔ اور ہم آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے چاروں طرف بھولی بھالی زندہ لڑکیوں کی ہزاروں چتائیں جلتی ہیں۔ اور ہم اُن کے شعلوں کی تپش تک محسوس نہیں کرتے۔ کس قدر مُردہ دِلی کتنی خوفناک غفلت!

(۲۳)

سات بجے میں کمرے سے نکلا۔ میرا دل خوش تھا۔ میں نے آج وہ نظم لکھی تھی۔ جو میں آج تک نہ لکھ سکا تھا۔ جنم اشٹمی کے تہوار کی بڑائی کو نظرانداز کرکے میں نے آج قوم کے نام ایک فریاد لکھی تھی۔ جس کے لکھنے میں فرض اور درد نے میرا ہاتھ بٹایا تھا۔

ساڑھے سات بجے میں جلسہ گاہ میں پہنچا۔ میرے آنے سے دُور دُور کی فضا میں ہلچل مچ گئی۔ بوڑھے بچے اور نوجوان سبھی عزت کی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ اِس قسم کے جلسوں میں میرے گیت اور میری ترنم بھری آواز اُنہیں بےخود کئے دیتی تھی۔

نظم کے پہلے تین بند سامعین نے نہایت جوش میں

سُنے - واہ وا اور زندہ باد کے نعروں سے شامیانہ ہلنے لگا۔ لیکن جونہی میں نے چوتھا بند پڑھا - تو ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی - پانچویں اور چھٹے بند کے وقت بھی یہی کیفیت رہی - میں سمجھا میری محنت اکارت گئی ہے - لیکن حقیقت اس سے مختلف تھی - فریاد کی تاثیر نے دلوں کو مسوس لیا تھا - سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے -

ساتویں اور آٹھویں بند پر پھر کھسر پھسر ہونے لگی - اور جب میں نواں بند پڑھنے لگا - تو طوفانِ بدتمیزی اُٹھا - جلسہ کے پریذیڈنٹ نے اشاروں ہی میں مجھے بیٹھ جانے کو کہا - کیونکہ ہجوم مشتعل ہو چکا تھا - اور کئی کونوں سے مجھے باغی - دہریہ اور بھرشٹ کی آوازیں آ رہی تھیں -

ایک بالی بدھواہ کی فریاد سب سننے کے لئے تیار تھے - لیکن بھگوان کرشن کا اُنپادِ سُننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا - اُن کے نزدیک بھگوان صرف حمد و ثنا ہی سننے کے لئے تھے - شکوہ اور فریاد سننے کے لئے نہیں - میں نے دیکھا - جو میرے عقیدت مند - قدردان اور مہربان تھے - سب کے سب غصے میں لال پیلے ہو گئے تھے - آج انہیں مجھ میں

دُنیا بھر کی کمزوریاں اَور گناہ و عیوب دکھائی دے رہے تھے۔

مَیں نے جلد جلد نظم پڑھی۔ اور آہستہ سے سٹیج سے اُترا اَور باہر نکلا۔

شامیانے کے باہر سُورج رام کمر جھکائے سوٹی کے سہارے کھڑا تھا۔ شاید اُسے ہجوم کی وجہ سے اندر جگہ نہ ملی ہو۔ اُس نے مجھے دیکھا۔ تو مُسکرا کر کہا۔ "مدھو بابو۔ یہ تم نے آج کیا لکھا تھا۔ بھلا بھگوان کے لئے اِس قدر سخت لفظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ بھگوان ہر حال میں بھگوان ہیں۔"

مَیں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اَور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ البتہ مجھے محسوس ہوُا۔ اگر سُورج رام میں آج شباب کی طاقت ہوتی۔ تو شاید سب سے پہلے وہی مجھے جلسہ گاہ میں حقیقت کو آشکار کرنے کے لئے بے عزّت کرنے کا فخر حاصل کرتا۔ حالانکہ اِس حقیقت کا احساس اُسی دن مجھُے اُس کی چتا کو دیکھ کر ہی ہوُا تھا۔ لیکن وُہ بے خبر تھا۔ وہ قسمت کا قائل اور بھگوان کا بھگت تھا۔ اُسے ہر ذرّے میں بھگوان دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اپنی بیٹی کی جلتی ہوئی چتا نہیں۔ جو صرف میں دیکھ سکا تھا ۔

لباس تلے

وشومبر بہت خوش تھا ـــــ

اُسے ساری دُنیا پھُولوں پر لوٹتی ہوئی دِکھائی دے رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ مالک نے اُسے بڑے دِن کی خوشی میں اپنا پُرانا اوورکوٹ عطا کیا تھا۔ کوٹ بظاہر نیا دکھائی دے رہا تھا۔ صرف اُوپر کا پلیش کثرتِ استعمال سے اُڑ گیا تھا۔ جیبیں پھٹ گئی تھیں۔ اور کہیں کہیں سے استر بھی غائب تھا۔

لیکن پلیش کا کیا ہے۔ گرمی تو کپڑے میں ہوتی ہے۔ جو مَیل جم جانے کے سبب موٹا نظر آ رہا تھا۔ اور جیبیں ـــ اُن کی مرمت آسان تھی۔

آج اُسے گھر کے چھوٹے بڑے حتیٰ کہ بدصُورت مالکن بھی شریف اور حسین دکھائی دے رہی تھی۔ ہاں حسین اور شریف،

جس نے اِس عطیے پر اعتراض نہ کیا۔ دراصل قیمتی لباس تلے اِن لوگوں کے سینوں میں بہت بڑے دِل ہوں گے جو ایسی بخشش کو بغیر کسی کوفت کے برداشت کر سکتے ہیں۔ ورنہ کہاں ۱۰ چھ روپے تنخواہ لینے والا وشومبر اور کہاں بالپ ... گنڈھ کا اوورکوٹ!

"بھگوان نے اِنہیں سب کچھ دیا ہے۔ صرف اِس لئے کہ اِن کی نیت صاف ہے۔" اُس نے دِل میں سوچا۔

اُس نے اپنے کمرے میں کوٹ کو پہن کر غور سے دیکھا۔ بالکل نیا کوٹ تھا۔ دو رویہ ہڈی کے بڑے بڑے بٹن لگے تھے۔ بائیں بغل میں چھوٹی سی جیب تھی۔ جس میں ایک ریشمی رومال رکھا ہوتے تھے۔ اِس کے علاوہ دو بڑی بڑی جیبیں بھی تھیں۔ لیکن دونوں پھٹی ہوئی۔ اوورکوٹ بظاہر نیا تھا۔

"بالکل نیا تو نہیں۔ دو تین سال کا ہے" وشومبر نے اپنے دِل سے کہا۔ "اِنسان کو خوب پہچانتے ہیں۔"

اِس سے قبل وہ کئی سال سے یہ کوٹ دیکھتے کا۔ اُسے جھاڑنے کا اُسے ترک کئے بالکل ٹھیک کر رکھنے کا عادی تھا۔ اور اُن دنوں یہ کوٹ زیادہ نیا نہ تھا۔ بٹن بھی اُتر گیا تھا۔ جیبیں بھی پھٹ گئی تھیں۔ استر بھی غائب تھا۔ لیکن آج اُسے اِس میں سب کچھ نیا اور اپنا پن سا دکھائی دیتا تھا۔ پھولوں میں چھپی ہوئی

عقیدت سا پر بے پناہ محبت چھا گئی۔ دل میں اپنی چیز کا پیار اُمڈ آیا۔ کمرے میں دو چار قدم ٹہلنے پر اسے اپنا بدن بھلا بھلا دکھائی دیا۔ بالکل مالک جیسا ـــــ اس کے بغیر وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ اپنی پُرشور جوانی۔ بھیگی ہوئی مسیں۔ جن کی مچھلیاں پھٹی ہوئی قمیص سے اُبھری ہوئی تھیں۔ اپنا دو ہاتھ چوڑا سینہ۔ مندر کی سیڑھی کے پتھر کی طرح مضبوط لیکن کھسی ہوئی پیٹھ۔ میلی اور تنومند ٹانگیں۔ کچھ بھی اُسے دکھائی نہ دیا۔ اُس کی نگاہوں کا مرکز اوور کوٹ تھا۔ یا اُس سے پرے مالک کی صاف نیت!

اب وہ مکمل انسان تھا۔ کوٹ کی گرمی نے اُسے کس قدر پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اِس کا احساس اُسے اب ہونے لگا۔ اب وہ اکڑ کر بازار بھی جائے گا۔ دکاندار سے جھگڑا بھی کرے گا اور تو اور سب کچھ کر سکے گا۔

ایک بار نفسانی خواہشات سے بے قابو ہو کر اُس نے ایک طوائف کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا تو کتنی آفت آگئی تھی۔ بازار کا بازار جمع ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ طوائف جاذب نظر تھی نہ جوان۔ لیکن پیاس کے وقت کون دریا کی لہروں کا حسن دیکھتا ہے۔ وہ شرمندہ ہو کر چپکے سے لوگوں کی گالیاں سن کر بھاگ نکلا تھا۔ شاید بات یہ تھی کہ اُس دن اُس کے بدن پر میلے اور پھٹے ہوئے کپڑے تھے۔ لیکن اب ـــــ اب قسمت کا پانسہ پلٹ

گیا تھا۔ اُسے اوورکوٹ مِلا تھا۔ اوورکوٹ پہن کر نکلنا اِس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی شریف اور سب کچھ کرنے کا مجاز ہے۔ اُس کے متعلق شک وشبہ کرنے کی مطلق گنجائش نہیں رہتی۔ اوورکوٹ اِنسان کے سب عیب حتیٰ کہ پھٹی ہوئی قمیص اور گھِسی ہوئی پیٹھ تک چھپا لیتا ہے۔

اُس نے کوٹ کو جھاڑ کر کھونٹی پر لٹکا دِیا اور اُوپر میلی چادر پھیلا دی۔

پہلے وہ کبھی کبھی کام سے اُکتا جاتا تھا۔ لیکن تازہ عطیئے نے اُس کے دِل میں زیادہ کام کرنے کی خواہش سی پیدا کر دی۔ کاش ایسا کام ملے جس کے لئے کوسوں دُور جانا پڑے۔ کوٹ پہن کر تکان بھی محسوس نہ ہوگی۔ قدموں میں ہوا کی تیزی اور رفتار میں بجلی کی سرعت پیدا ہوگی۔ اور بدن ——— گرم اور حسین۔ حسین اور شریف، بالکل مالک جیسا نظر آئے!

بابو سری کنٹھ نے اپنے لئے دوسرا کوٹ سِلوا لیا تھا۔ اُن ایسے صاحب دولت مند لوگوں کے لئے اوورکوٹ نہایت ضروری ہے اور خصوصاً سردیوں کے آغاز میں جب سرد اور خنک ہوائیں بھلے چھپے ہوتے ہیں

بوٹے بِن کی خوشی کے ساتھ ساتھ نئے کوٹ پر جشن بھی ہو رہی تھی۔ یار دوستوں کی نظر میں کپڑا ... سلائی ... ڈیزائن پر کھ

رہی تھیں۔

"کپڑے کا ڈیزائن جاذب نظر ہے۔" ایک نے کہا۔

"سلائی بہترین ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"لیکن اس میں سوت بھی ملا جلا نظر آتا ہے۔" تیسرے نے ہنستے ہنستے خطرناک انکشاف کیا۔

بابو سری کنٹھ، اُن کی بیوی اور باقی دوست چونک اُٹھے!

"سوت؟"

"کم سے کم دس فی صدی ہوگا ـــــ لیکن قابل برداشت! اور تو اور آج کل خالص اُونی چیز ملے گی کہاں سے؟" انکشاف کرنے والے دوست نے سنجیدگی سے کہا۔

بابو سری کنٹھ نے جلد جلد کوٹ کے اندر کی طرف سے ایک دھاگہ کھینچ لیا اور اُسے دیا سلائی دکھا دی۔ دھاگہ آہستہ آہستہ جل کر ختم ہو گیا۔

"دیکھ لیا صاحب! اُون ہوتی تو کمبخت جل کر سکڑ جاتا۔" بابو سری کنٹھ کی حیرانی میں اضافہ ہوا۔ "عجیب ہے نہ" اُنہوں نے بیوی سے کہا۔

وشومبر دروازے پر یہ باتیں سن رہا تھا۔ سوت اور اُون کی پہچان اُس کے لئے بالکل نئی تھی۔ فانک کے فرشتہ ہونے میں اب کچھ بھی باقی نہ رہا۔ پہلے وہ انسان پہچان سکتے تھے اب سوت

اور اُون بھی پہچانتے ہیں۔ اُسے دُکاندار پر، جس کے ہاں سے مالک نے یہ کپڑا خریدا تھا۔ بہت غصہ آیا۔ "کمینہ، سالا ــــ نیت دیکھے بغیر ہی دھوکہ دیتا ہے۔"

"اور میرا کوٹ ــــ" اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔

وُہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کوٹ کو کھونٹی سے اُتار کر جیب کے پاس سے ایک دھاگہ نکال لیا اور اُسے دیا سلائی دکھا دی۔ دھاگہ یکلخت جل کر سُکڑ گیا۔ دھوئیں میں کراہت نہ تھی۔ بھُنے ہوئے گوشت کی سی بُو تھی۔

"آہاہا ــــ خالص اُون ــــ" اُس نے فرطِ مسرت میں اُچھل کر کہا۔

"مجھے دھوکہ نہیں لگا ــــ میرے کوٹ میں سُوت، دس فی صد سُوت نہیں۔" اُس نے اپنے آپ ہی سے کہا۔

آخر بابوجی تو نادان نہیں۔ جو آٹھ برس کے نوکر کو سُوت اور اُون کا بنا ہوا کوٹ دے دیتے۔ اُنہوں نے اُسے انسان پہچان کر ہی یہ بخشش دی تھی۔

بحث ختم ہو چکی تھی۔ بابو سری کنٹھ کو نقصان کا بے حد افسوس تھا۔ وُہ ہزاروں روپے کے مالک تھے۔ لیکن جان بوجھ کر اُنہوں نے ایسا نقصان نہ اُٹھایا تھا۔ وشمبر دوبارہ دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ وُہ اِس وقت کام کا طلبگار تھا جس کے لئے اُسے کہیں دور

جانا پڑے۔

مالک نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "میرا پُرانا اوورکوٹ خالص اُونی ہے۔ وہ مَیں نے جیون سنگھ کی دُکان سے لیا تھا ــــ جبھی بارہ برس چلا۔"

وشومبر کے دِل میں مالک کے اِن الفاظ نے ذرا خراش سی پیدا کر دی۔ کاش! مالک نے میرا پُرانا اوورکوٹ نہ کہا ہوتا۔ وشومبر کا کوٹ کہا ہوتا۔ تو وشومبر کس قدر پھُول جاتا۔ پھر بھی اُس کا بدن مُسکرا اُٹھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں فرطِ خوشی سے پھُول گئیں۔ اور سینے میں کشادگی سی آگئی۔

مُسکرا کر اُس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ ــــ ؟"

اِس سے آگے بولنے میں اُسے خوف سا محسُوس ہُوا۔ بولے یا نہ بولے۔ لیکن گھر اپنا تھا۔ مالک اپنا تھا۔ مالکن اپنی تھی۔ سبھی اپنے تھے۔

مالکن نے نئے کوٹ کو اُوپر نیچے کرتے ہوئے بے پروائی سے پُوچھا۔ "کیا؟"

وشومبر کی ہلکی سی مُسکراہٹ دبے ہوئے قہقہے میں بدل گئی۔ مَن کے گُم گشتہ الفاظ کو سہارا مِل گیا۔ وُہ ایک قدم اندر آگیا۔ بدصُورت مالکن اُسے اِس وقت بے حد حسین دکھائی دی۔

وشومبر نے آہستہ سے کہا۔ "آپ میرا کوٹ پہنیں ــــ

وہ خالص ——"

بابو سری کنٹھ اور اُس کے احباب ہنس پڑے۔ لیکن مالکن کا سارا غصّہ جو ابھی ابھی وشومبر ہی کو دکھائی دیا تھا۔ بدصورتی میں تبدیل ہو گیا۔

"بے وقوف —— گدھا!" اُس نے چمک کر کہا۔

وشومبر کی مُسکراہٹ بُلبلے کی طرح سطح ہی پہ غائب ہو گئی اور وہ ہاتھ چوڑا سینہ سکڑ کر پُرانے اوورکوٹ کی چھوٹی جیب کے باہر پہ ہو گیا۔

اُس نے اپنی طرف سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن چھبتی وہ بے وقوف تھا اور گدھا! حالانکہ گدھا اُس کے خیال میں اتنا بیوقوف نہیں جتنی وہ کم ظرف طوائف، جس نے اُس کے محسوسات کا اندازہ لگائے بغیر ہی اُسے بے عزّت کر کے لوٹا دیا تھا۔ اُس دن اُس کی جیب میں پُورے آٹھ آنے تھے۔ اور یہ رقم اُس نے صرف اُسی کے لئے بچا بچا کر رکھی تھی۔ لیکن بے وقوف —— محض بے وقوف! جس نے دوار پر آئی ہوئی دولت ٹھکرا دی۔ طوائف نے اُس کی جیب میں پیسے نہیں دیکھے۔ صرف اُس کا لباس دیکھا۔ لباس تلے کیا تھا۔ یہ اُس کی فریب خوردہ نظریں نہ دیکھ سکیں۔

وہ کمرے سے نکل ہی نہ سکا۔ فریب مسرت پر وہ دروازے سے ایک قدم اندر آ گیا تھا۔ اِس وقت وہ صرف ایک ہی قدم

دکھائی دیا۔ لیکن اب جیسے کوس بھر زمین دروازے تک پھیلی ہوئی تھی۔ وُہ مشکل سے باہر نکلا۔ اُس کا بدن ٹُوٹا ہُوا تھا۔ گھر ہی میں اُس نے کتنا لمبا سفر کیا تھا۔ "کاش! اوورکوٹ پہن کر کیا ہوتا!"

دوسرے دن گھر کا کام کر کے اور مالک کے کام پر چلے جانے کے بعد اُس نے اوورکوٹ پہنا۔ شیشے کو سامنے رکھ کر صافہ باندھا۔ رات کا دھویا ہُوا پائجامہ کہیں کہیں سے گیلا تھا لیکن ٹانگوں نے، پیٹ نے، یا رانوں نے نمی بالکل محسوس نہ کی۔ اُسے اتنا بھی خیال نہ رہا کہ پائجامے میں نیل کہاں کہاں زیادہ لگی ہے۔ اور کہاں کہاں مَیل اُبھر گیا ہے۔ اُسے اس وقت اپنا آپ خوبصُورت دکھائی دیا۔ اور جب ہڈی کے بڑے بڑے بٹن کاجوں میں پیوست ہو گئے۔ تو وُہ بہت اچھا —— نہیں مکمّل انسان سا نظر آنے لگا۔ جیبوں کا استر پھٹ گیا تھا۔ لیکن باطن کو کون دیکھتا ہے۔ بارہ آنے کی ریزگاری اُس کی واسکٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔

وُہ آج سارے شہر کا گشت لگانا چاہتا تھا۔ حالانکہ اِس سے قبل ہزاروں بار شہر کا گشت لگا چکا تھا۔ اور شہر کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ لیکن اُن دنوں وُہ صرف وشومبر تھا۔ آج مکمل انسان ہے۔ آج کی خوشی میں اُسے بے حد لذّت اور شیرینی محسوس ہو رہی ہے۔ وُہ زمین پر نہیں، ہوا پر اُڑا جا رہا ہے۔ اور سڑکیں

جن سے وہ مانوس رہتے ۔ آج اُجلی اور بالکل مختلف سی نظر آرہی ہیں ۔

وہ ہر راہ چلنے کو بغور دیکھتا اور اپنی اور اُس کی پوشاک کا موازنہ کرتا ۔ اُن میں کتنے ہی شریف اور شاید اعلےٰ افسر بھی تھے ۔ لیکن اُن کی پوشاک چال ڈھال اور طرزِ رفتار میں اُسے اپنے سے کچھ بھی زیادہ نہ دکھائی دیا ۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ایسے انسانوں میں اکثر تپلے پتلے اور سوکھے ہوئے سے تھے ۔ وہ خود اُن کے مقابلے میں کافی مضبوط تھا ۔ اُس کا جسم گوشت سے بھرا ہوا تھا اور سینہ دو ہاتھ چوڑا ۔ لیکن اوورکوٹ سب ایک سے تھے ۔ ڈھیلے ڈھیلے کون جانے ، خالص اُونی یا دس فیصد سُوت والے !

وہ آگے چلتا گیا ۔ بالکل غیر ارادی طور پر ۔ کبھی کبھی جب بے اختیار اُس کے ہاتھ جیبوں میں چلے جاتے اور اُنگلیاں پیٹ سے چھو جاتیں تو اُسے احساس ہوتا کہ اوورکوٹ کی جیبیں پھٹی ہوئی ہیں ۔ وہ گھبرا کر آگے پیچھے دیکھتا کہ کسی نے اُنگلیوں سے پیٹ کو چھوتے تو نہیں دیکھا ۔ لیکن دُنیا باطن کو نہیں دیکھتی ۔ وُہ صرف ظاہر پرست ہے ۔ اور وشومبر ظاہرا طور پر آج بالکل شریف اور مکمل انسان دکھائی دے رہا تھا ۔

سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر رضائیاں اوڑھے کتنے ہی بھکاری بیٹھے ہوئے تھے ۔ اِن کی نقل و حرکت سے ، اُن کے لباس

سے اور اُن کی منتشر نگاہوں سے مجبوری اور زندگی سے تنفر ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن اُن کے پیلے پیلے چہروں پر اطمینان تھا ــــ اطمینان جو انتہائی نا اُمیدی کے بعد خود بخود حاصل ہوتا ہے۔ دُنیا اُن سے بے پروا تھی۔ اُس نے اُنہیں ظاہر پرستی کی کسوٹی پر پرکھ کر کھوٹے بال کی طرح ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن اُن کا باطن ابھی پرکھا نہیں گیا تھا۔ اُن کے لباس تلے پُرشور جوانیاں بھی تھیں۔ اور دہکتی ہوئی بھٹیاں تھی، جو دھیرے دھیرے وہیں ٹُٹ پاتھوں پر آپ ہی آپ بجھتی جا رہی تھیں۔ اُن کی پوشیدہ آگ میں کتنی حرارت رکھتا جوش اور کتنی روشنی تھی۔ یہ کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ دُنیا دیپ جوالا کی طرح اُن کی روشنی سے بیزار، اُن کے وجود سے مُنکر اور اُن کی حرارت سے متنفر تھی۔ محض بے کار لوگ ــــ جو سڑکوں پر کتّوں کی طرح مرنے کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ جو کھاتی پیتی دُنیا کو اپنی بے جان آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ رہتے ہیں اور ترستے ترستے، آہیں بھرتے بھرتے۔ ہاتھ پھیلاتے پھیلاتے، وہیں اُونی دھاگے کی طرح یک لخت جل کر سُکڑ جاتے ہیں یا اُوزھر جاتے ہیں۔

اور موٹروں میں گھومنے والے، رخساروں پر غازہ ملنے والے، دُنیا کو اپنی ٹھوکروں میں اُچھالتے پھرتے ہیں۔ دُنیا نے اُن کے ظاہر و باطن دونوں کو پرکھا ہے۔ اُن کے لباس کی نفاست اور

لباس تلے کی نیم و زرسے اٹی ہوئی جیبیں، دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ وہ اِن کی بجھی ہوئی حرارت سے ٹھنڈی پڑی ہوئی مٹھیوں سے اپنا نظام چلا رہی ہے۔ اور انہیں سُوت کے دھاگے کی طرح آہستہ آہستہ جلنے اور ختم کرنے کی متمنی ہے۔

"یہ لوگ اوورکوٹ کیوں نہیں پہنتے؟" وشومبر نے اپنے دل سے پوچھا۔

پھر ایک لیٹے ہوئے بھکاری سے بولا۔ "تمہارے پاس اوورکوٹ نہیں؟ — میرا مطلب ہے، خالص اُونی اوورکوٹ!"

بھکاری نے نرالی بات سُنی۔ "اوورکوٹ! خالص اُونی!" وہ وشومبر کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اور نہ سمجھنے کی کمزوری ہمیشہ مسکراہٹ سے چھپائی جاتی ہے!

دوسرے ہی لمحہ میں بھکاری کے مطمئن چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُسی طرح اُس نے لیٹے ہی لیٹے کہا۔ "شکر ہے جیتے ہیں!"

وشومبر نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اوورکوٹ کے بغیر ہی، وُہ اپنے جینے پر شکر کر رہا تھا اور مطمئن تھا۔

"کاش! اِن لوگوں کے بھی مالک ہوتے۔ جو بڑے دِن کی خوشی میں انہیں اپنے پرانے اوورکوٹ عطا کرتے۔" وہ اور آگے بڑھا۔ اُسے گھر یاد ہی نہ رہا۔ بدن پر پہنے ہوئے کوٹ اور

واسکٹ میں لپٹی ہوئی ریزہ گاری نے اُس کے جذبات میں رنگ بھر دیا تھا۔

اُس نے اپنے دل میں کچھ سامان خریدنے کی بھی ٹھان لی۔ صافہ باندھنے کا شیشہ، جو مالک کے کمرے سے کبھی کبھی اُٹھا لاتا تھا۔ ایک چمٹا۔ جس کے بغیر چلم پر آگ رکھتے وقت اُس کی اُنگلیاں جُھلس جاتی تھیں۔ ایک خوشبودار صابون کی ٹکیا۔ فینائیل کی گولیاں جو گرمیوں میں اوورکوٹ کے بچاؤ کے لئے ضروری تھیں ——

سامنے تصاویر کی دکان تھی۔ اوورکوٹ پہنے کچھ لڑکے اور لڑکیاں تصویریں خرید رہی تھیں۔ وشومبر بھی دُکان پر چڑھا۔ اُسے دکان پر چڑھتے وقت کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی۔

اُس کے کمرے میں کوئی تصویر نہ تھی۔ ماسوائے ایک کرم خوردہ تصویر کے، جو وہ نہ جانے کب کسی بزاز کی دُکان سے اُٹھا لایا تھا۔

اور سامنے شلفوں پر، الماریوں میں، دیواروں پر دیدہ زیب تصویریں لٹک رہی تھیں۔ حُسن اور جوانی کی نیم عُریاں اور نیم خنداں تصویریں! جو مکمّل انسان کے کمرے کی زینت بننے کے لائق تھیں۔
اُس نے ایک ہی نظر سے ساری تصویروں کا جائزہ لیا۔ کاش! یہ ساری تصویریں اُس کے کمرے کی دیواروں پر لٹکتیں تو اُس کی زندگی کتنی مسرّت میں گزر جاتی!

دکان کے مالک نے قریب آکر پُوچھا۔ "حکم ؟"

وشومبر شش و پنج میں پڑ گیا۔ وُہ حکم کرنے کا عادی نہ تھا۔ حکم کی تعمیل کرنا اُس کی خو تھی۔ وُہ دراصل یُونہی دُکان پر چڑھا تھا۔ اَور اوورکوٹ پہن کر دکان پر یونہی چڑھنا کچھ بُرا نہیں۔ یوں بھی تصویر اُس کے ضروری سامان کی فہرست میں نہ تھی!

وشومبر کی حیرت کو بھانپ کر دکان دار نے پھر پُوچھا۔ "کیا حکم ہَے سرکار؟"

کتنی حلیمی اَور کتنا پیار تھا ان الفاظ میں! وشومبر کے کان ایسے الفاظ سے نا آشنا تھے۔ مکمّل اِنسانوں کی دُنیا میں کتنی راحت اَور کتنی محبّت ہوتی ہَے۔ یہ اُسے اس وقت معلوم ہوُا۔ جب وُہ خود مکمل انسان کے بھیس میں اِس دُنیا میں آگیا۔ وُہ کئی بار پہلے بھی اِس دکان کے آگے کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن دکان دار نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ آج وُہ بات نہ تھی۔ آج ہزاروں روپے کا مالک اُس سے پُوچھ رہا تھا۔ "کیا حکم ہَے سرکار؟"

اَور وشومبر کے واسکٹ میں بارہ آنے تھے۔ اوورکوٹ کی پھٹی ہوئی جیب میں ہاتھ ڈال کر اُس کی اُنگلیاں ریزگاری سے چھُو گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔

اُس نے ایک نیم عُریاں فلم ایکٹرس کی تصویر اپنے لئے منتخب کی۔ جس کی باریک ساڑھی پر سلمے ستارے کا کام کیا ہوُا تھا لیکن

پھر بھی اُس کی سڈول ٹانگیں، گول گول بازو، چاند سا شفاف سینہ صاف نظر آرہا تھا۔ دُکان دار نے تصویر کاغذ کے لفافے میں ڈال کر اُس کے آگے رکھ دی اور کہا "ڈھائی روپے!"

وشومبر کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ نتھنے پھول گئے۔ وہ ہوا میں لٹک رہا تھا۔ اب زمین پر آگرا۔ "اتنی مہنگی؟" اُس نے سوکھی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "تصویر ہی تو ہے!"

خرید و فروخت کرنے والی لڑکیوں نے اُس کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور زیر لب مسکرا کر آنکھیں پھیر لیں اور دُکان دار نے زور سے قہقہہ لگایا۔

وشومبر نے محسوس کیا۔ جیسے وہ قہقہہ نہیں، توپ ہے۔ اُسے اپنے حُسنِ انتخاب پر افسوس آگیا۔ اور اپنی نادانی پر رنج، جس نے اُسے دُکان پر چڑھنے کی ترغیب دی حالانکہ تصویر اُس کی ضروریات زندگی کی فہرست میں نہ تھی!

"نہ جانے کس کا کوٹ پہن رکھا ہے غریب نے؟"

ایک شوخ لڑکے نے مالک دُکان سے ہنستے ہنستے کہا۔ "تصویر بھی خوب پسند کی تھی ——— ہاہاہا۔"

وشومبر کا چہرہ ندامت سے لال ہوگیا۔ اُسے اِس وقت گیلے پائجامے کی نمی ٹانگوں پر محسوس ہوئی اور کہیں کہیں اُبھرا ہوا میل بھی دکھائی دیا۔

"کِس کا کوٹ؟" دُکان سے اُتر کر اُس نے اپنے دِل سے پُوچھا۔ "میرا مالک سُوت اَور اُون پہچان سکتا ہے۔ اِنسان پہچان سکتا ہے۔ اَور یہ لفنگا ــــ بدمعاش ــــ"

ایک گلی میں داخل ہو کر اُس نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھا "ہاں، وہی اوورکوٹ تھا۔ وُہی جو مالک نے اُسے دِیا تھا۔ جو اُس کا تھا۔ صرف اُس کا! غریب کے بدن پر اچھا کپڑا دیکھ کر بھی یہ لفنگے خوش نہیں ہوتے۔"

یہی سوچتا سوچتا وُہ شہر کی طرف مُڑا۔ شیشہ، چمٹا، صابون کی ٹکیا اَور فینائیل کی گولیاں سب کچھ بھُول گیا۔

تفریح طبع کے لئے اُس نے سگریٹ کی ڈبیا خرید لی۔ اَور ایک پان بھی مُنہ میں رکھ لیا۔

بے عزّتی کا اُسے زیادہ احساس نہ ہوا۔ "دُنیا میں سبھی کچھ ہوتا ہے۔ دھوکہ۔ فریب۔ گالی گلوچ۔ یہاں سبھی جیون سنگھ نہیں۔ جو خالص اُونی کپڑا دیں۔ جس میں سُوت کی آلائش تک نہ ہو" اُسی وقت اُسے وُہ طوائف یاد آگئی۔ جس نے اُسے کچھ عرصہ پیشتر بے عزّت کیا تھا۔ صرف اِس لئے کہ طوائف کی نگاہوں نے ظاہری وشنومبر کو دیکھا تھا۔ باطنی وشنومبر کو نہیں۔ جہاں مٹی اَور گھاس پھُوس کے نیچے ڈھکی ہوئی برف کی طرح محبّت تھی۔ پگھلنے کے لئے بیقرار محبت! آج اگرچہ اُسے اپنے جذبات پر قابُو تھا۔ لیکن

انتقام بھی کیا بُرا ہے؟ آج وُہ طوائف کو بتا دینا چاہتا تھا۔ دُنیا کتنی اندھی ہے۔ جیسے اُس نے ایک دن پھٹے ہوئے کپڑوں میں دیکھ کر دھتکارا تھا۔ آج وہی بھونرے کی طرح اُس کے حُسن کا رس چُوس کر گاتا گاتا چلا جائیگا۔ اور اندھی دُنیا، اندھی عورت، اندھا بازار دیکھنے کا دیکھتا رہ جائیگا!

اُس کا رواں رواں دماغ کی اِس جدّت آفرینی پر جھومنے لگا۔ اُسے اِتنا بھی خیال نہ رہا کہ منہ میں رکھا ہُوا پان کہاں گیا؟ اُس کی پیک کہاں گئی؟ ہاں شیرینی اس کے مُنہ میں جاتی تھی۔

وُہ سیڑھیاں چڑھا۔ آنکھ سے اشارہ کرنے کے دن اُسے کُتے کی طرح چوکنّا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنا پڑتا تھا۔ پھر اُس نے بائیں آنکھ کو زور سے جھپکا دیا تھا۔ لیکن آج سڑک پر چلنے والوں کی موجودگی میں، دکان پہ بیٹھے ہُوئے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے، سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا ہُوا اُوپر چڑھا۔ دروازے پر میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ جس پر خالص اُون کے دھاگے سے نقوش کاڑھے گئے تھے۔ کبھی یہ پردہ بہت جاذب نظر اور خوبصورت ہوگا۔ لیکن اب طوائف کی طرح اُس کے نقش مٹے ہوئے اور پھیلاؤ میں بے ترتیبی سی آگئی تھی۔ وُہ ذرا ٹھٹھک گیا لیکن عارضی طور پر ——— وُہ آج بہت مضبوط تھا۔

"اندر آ جائیے!" شباب سے ڈھلی ہوئی طوائف نے اُسے

دیکھتے ہی پُر تپاک لہجے میں کہا۔

وشومبر نے بُوٹ اُتارا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی سلام کیا۔

"خان نے بھیجا ہے؟" طوائف نے پُوچھا۔

وشومبر سوال پر حیران رہ گیا۔ طوائف نے پھر پُوچھا۔ "کہاں سے آرہے ہو؟"

وشومبر نے سگریٹ کو اُنگلیوں ہی میں بُجھایا۔ اُسے آگ کی حرارت محسُوس ہی نہ ہوئی۔ اُس نے آہستہ سے مصنوعی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میں ——— خود آیا ہُوں۔"

طوائف کے پھیکے سے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "خوب! میں بھی کتنی بے وقوف ہوں ———"

وشومبر کے غیر ارادی جذبات مچل اُٹھے۔ اُسے پیاس بھی لگ گئی۔ دریا اُس کے سامنے تھا اور دریا کی لہروں کا حُسن بھی۔

طوائف ناز و ادا سے اُس کے قریب شکستہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ ہی وشومبر بھی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ "آپ کیا پسند کرتے ہیں۔ وسکی یا رَم؟"

وشومبر کے لئے دونوں چیزیں نئی تھیں۔ پھر بھی کمزوری کو چُھپاتے ہوئے اُس نے کہا۔ "رَم!"

دُوسرے لمحے میں ایک بُوڑھا رَم کی بوتل اور دو گلاس

لے کر حاضر ہو گیا۔ اور بولا۔ "ڈھائی روپے۔"

وشومبر شکستہ صوفے کی سپرنگ والی گدیوں پر بیٹھا تھا۔ ڈھائی روپے کا لفظ سُن کر اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے نیچے عمیق غار ہے۔ جس میں وُہ اُترتا جاتا ہے۔ اُس لئے اپنا داہنا ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں ڈالا اور ناخن سے اپنے پیٹ پر اندر ہی اندر لکیریں کھینچنے لگا۔ طوائف نے مُسکرا کر کہا۔ "بل دیجئے اسے۔ چلا تو جائے۔"

وشومبر کا چہرہ کنپٹیوں تک جل گیا۔ جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔ "افسوس ہے۔ مَیں بٹوہ بھُول آیا۔"

طوائف کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ بولی۔ "پھر یُونہی عشق کرنے آئے تھے؟ جیسے تمہاری ماں کا گھر ہے۔"

وشومبر کچھ بھی نہ بول سکا۔ اُس کی جیب میں صرف ساڑھے نو آنے باقی رہ گئے تھے اور ابھی ضروریات کی فہرست باقی تھی۔ مچلے ہوئے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ پیاس بجھ گئی۔ وُہ اُٹھ کر دروازے کے قریب آیا۔ اور بُوٹ پہننے لگا۔

طوائف نے زہر خند کر کے کہا۔ "یہ کِس کا کوٹ پہن رکھا ہے، جو بٹوہ ہی گھر پر بھُول آئے۔"

وشومبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وُہ جلد جلد سیڑھیوں سے اُترا۔ گذشتہ واقعہ اُس کی آنکھوں میں دوبارہ پھر گیا۔ اُس

نے دُنیا کو اندھی سمجھ لیا تھا۔ لیکن اب اُسے معلوم ہُوا۔ دُنیا اندھی نہیں۔ وُہ خود اندھا ہے۔ مالک نے اُسے ایسا کوٹ دیا۔ جن کی جیبیں پھٹی ہوئی تھیں۔

وُہ اب بازار سے گذر ہی نہ سکا۔ کاش اُس کے پاس روپے ہوتے۔ وُہ اپنے ارمان نکالتا۔ تصویریں خریدتا۔ روز پیتا اور ——"

اب تک اُسے اپنا آپ ہلکا ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اب کوٹ کے بوجھ سے اُس کے شانے ٹوٹ سے گئے تھے!

اُسے معلوم ہُوا مچھلیوں والے بازو، پُرشور جوانیاں۔ مطمئن چہرے۔ خالص اُونی کوٹ، سب اِس دُنیا کے سامنے فضول اور بے حقیقت ہیں۔ حقیقت صِرف پیسہ ہے۔ ابھی وُہ وقت نہیں آیا۔ جب اِنسان کے قانون میں تنومندی کا احترام ہو۔

وُہ دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہُوا گھر جانے لگا۔ راستے میں کتنے ہی لوگ اوور کوٹ پہنے جا رہے تھے۔ لیکن اس وقت وشومبر کا دماغ موازنے کی لذّتوں سے اُسے فریب نہیں دینا چاہتا تھا۔ آنگن میں پہنچ کر کتا بھونکنے لگا۔ حالانکہ اُسے معلوم تھا۔ یہ مالک کا وشومبر ہے۔ لیکن پرایا کوٹ بدن پر

دیکھ کر حیوان نے بھی تعجب کا اظہار کیا۔

"ابھی اُتارتا ہوں بھئی۔ یہ میرا کوٹ نہیں۔ تمہارے ہی مالک کا کوٹ ہے۔" شوشیر نے جل بھن کر کتے سے کہا۔ کُتا جیسے مفہوم سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

کمرے میں شوشیر نے کوٹ اُتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ نہ اُس پر میلی چادر پھیلائی اور نہ لٹکانے سے پہلے جھاڑا۔ اُتارتے اُتارتے اپنے ہی آپ سے کہنے لگا۔ "دیوتا! یہ کوٹ واپس لے لو—— ہم لوگ ان چیزوں کو پہن کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ سر بازار بیٹھنے والی طوائف اور پالے ہوئے کتے تک کو اعتبار نہیں آتا کہ یہ میرا کوٹ ہے۔ ہم انسانیت کے بے پناہ جوہر کے بچھڑے ہیں جو گندگی ہی میں موٹے ہوتے ہیں اور زندہ بھی رہ سکتے ہیں۔ ہماری بے رنگ و بُو زندگیوں کے سکون کو اپنی دُنیا کی لذتوں سے آشنا کر کے فنا نہ کرو۔ ہم ابھی انسان نہیں—— ! ہم ابھی انسان نہیں !!

لہروں کا رقص

روف، چاند سنگھ، مولوی، جمال۔ روڈا اور بھی کتنے ہی قلی
چک پوسٹ کی منڈی میں کام کرتے تھے۔ سب کی نفسیات جُدا
تھی۔ اور سب کے نظریے مختلف مثلاً چاند سنگھ ہر وقت گرد سے
اٹی ہوئی ڈاڑھی کو اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے کا عادی تھا۔
مولوی فرصت کے لمحوں میں یا تو نماز پڑھتا تھا۔ یا کچھ گنگنایا کرتا
تھا۔ روڈا بخشش کے پیسے جمع کرنے کی فکر میں گھلا جاتا تھا۔ جمال
کو اپنی بزرگی پر ناز تھا۔ اور یہ ناز اس وقت نمایاں ہوتا تھا جب
وہ آدھا لیٹ آدھا بیٹھا چلول کرتا تھا۔ لیکن روف ان سب سے نرالا
تھا۔ پست قامت، لنگڑا، جانور نما انسان، جس کی پیشانی پر نہ کبھی
بل پڑتے تھے۔ اور نہ جس کی آنکھیں کبھی آنسو بہاتی تھیں۔ اُس نے
شاید دُنیا کو چک پوسٹ کی منڈی سے زیادہ نہیں سمجھ رکھا تھا۔

جہاں دِن بھر ہزاروں قسم کے اِنسان جمع ہوتے ہیں۔ زادِ راہ کھوتے ہیں۔ تلاشیاں دیتے ہیں۔ ایک دُوسرے سے ہمدردیاں جتاتے ہیں۔ چیک پوسٹ کے افسروں کے فرضِ منصبی کو نگاہوں نگاہوں ہی میں اپنے اُوپر زیادتی سی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اظہار نہیں کر سکتے اور بچھڑ جاتے ہیں۔ دُنیا کی پریشانیوں سے اپنے آپ کو بے نیاز رکھنے کے سبب ہی شاید وہ سب قلیوں سے ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ اُسے نہ مذہب کی پروا تھی۔ نہ پیسے جمع کرنے کی خواہش ہر وقت ہنسنا ہنسانا، فقرے چُست کرنا، اور لنگڑاتے لنگڑاتے بوجھ ڈھونا اُس کا معمول تھا اپنے ساتھیوں میں جن کے ساتھ اُس کی زندگی بسر ہو رہی تھی۔ ہر دلعزیز ہونا کوئی معمُولی بات نہ تھی۔ سیّاح بھی ایک ہی نظر دیکھ کر اُس کی جدّت پسندی اور آزاد فطرت کی داد دیتے تھے۔ شگفتہ مزاجی کے علاوہ اُس کی طبیعت میں خودداری کا بھی بہت بڑا عنصر تھا۔ اِسی لئے چاند سنگھ اور رودڑا کی طرح سیّاحوں سے گڑگڑا کر وہ بخشش کبھی قبُول نہ کرتا تھا۔ ہاں کِسی نے خندہ پیشانی سے کچھ دِیا۔ تو روف نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دِیا۔ اور روف کی یہ عادت ساتھی قلیوں کے نزدیک بہت بُری تھی۔ نہایت قابلِ اعتراض!

دو ڈھائی من کا بوجھ سر پر اُٹھائے ہوئے بھی اُسے مذاق

ہی کی سُوجھتی۔ کوئی پاس نہ ہوتا۔ تو کمر پہ لادے ہوئے بوجھ ہی کو یا اُس کے ان دیکھے مالک کو ایک میٹھی سی گالی سُنا دیا۔ اور اوپر قہقہہ لگا دیتا۔ ایسے مذاق صرف اُسی وقت کثرت سے ہوتے۔ جب اُس کی خوددار طبیعت تھے بارہ آنے سے زیادہ پیسے قبول کر لئے ہوتے۔ اور اُس کے تصور پہ اُبلے ہوئے انڈے کی چکنی چکنی سفیدی اور دلنواز شیرینی چھائی ہوئی ہوتی۔ جو قریب کے ریسٹوران میں وہ کھانے کا عادی تھا۔ اُس وقت اُس کے طرزِ کلام میں خود بخود تحکمانہ انداز پیدا ہو جاتا۔ اور بالکل وُہی لب و لہجہ استعمال کرتا۔ جو دن میں کئی بار وُہ چھٹی پر آئے ہوئے فوجیوں کی زبان سے سُننے کا عادی ہو چکا تھا۔ جو وُہ ریسٹوران میں داخل ہوتے وقت سفید وردی میں ملبوس خانساماں سے کیا کرتے تھے۔ آخر اُن میں اور اُس میں کیا فرق تھا۔ مقررہ تنخواہ کے علاوہ اُس کی جیب میں بارہ آنے سے زیادہ رقم آ چکی تھی۔

"ایک انڈا مانگتا ہے۔" وُہ خانساماں سے کہہ کر کرسی پر بیٹھنے کے لئے اندر چلا جاتا ہے۔

"رکابی کہاں ہے؟ رکابی میں انڈا لے آؤ۔"

"رکابی ___؟" خانساماں تعجب سے اُس کی طرف دیکھتا ہے!

"ہاں - ہاں - رکابی ـــــ میں انسان نہیں ہوں ـــــ بے وقوف گدھا!"

خانساماں چینی کی رکابی میں انڈا اُس کے سامنے رکھ دیتا - اور زیرِ لب مسکرا دیتا - لیکن اُس کی مسکراہٹ جس میں طنز کا پہلو زیادہ ہوتا - روف کے سر کے اُوپر سے اُڑ کر چلی جاتی -

انڈا کھانے کے بعد وہ بسا اوقات اپنا منہ اُسی چادر سے صاف کرتا - جو میز پر بچھی ہوتی -

اِس ناشتے سے جو اُسے کبھی کبھی ہی میسر ہوتا تھا - اُس میں نئی جان سی پیدا ہو جاتی - دِن بھر تھکنے کے سبب سے مذاق کے پُرسکون سمندر میں پھر لہریں اُٹھنے لگتیں - لیکن اُس وقت منڈی خالی ہو چکی ہوتی - سستا حمل سے بھری ہوئی گاڑیاں - چیک پوسٹ کے افسر اور ملازم - دلال اور کبوتروں کا ڈار چلا گیا ہوتا - اور ٹاؤن ایریا کا بوڑھا بھنگی جھاڑیوں کے جھاڑو سے سڑک پر بکھری ہوئی لید، گوبر اور گھاس پھوس کو دریا کے کنارے کی طرف دھکیلتا ہوا دکھائی دیتا - جمال، چاند سنگھ، روڈا اور باقی قلی دریگ کے نیچے لمبے لمبے لیٹے ہوئے ہوتے - اور نیچے سطح دریا پر لہریں بن بن کر بگڑتیں - اور بگڑ بگڑ کر بنتیں -

ایک شام کو انڈا کھانے کے بعد جب وُہ سڑک پر آیا۔ تو اُس کی نظر سیدھی مولوی پر جا پڑی ۔ جو سڑک کے کنارے بنی ہوئی چوڑی مگر پست قامت دیوار پر نماز پڑھ رہا تھا۔

روف لنگڑاتے لنگڑاتے اُس کے قریب آگیا۔ پرسکون سمندر میں جوار بھاٹا پیدا ہونے لگا تھا۔ اور لہریں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر بے نیل مرام لوٹ رہی تھیں۔

روف نے ہنس کر کہا۔" بھائی! مَیں نے انڈا کھایا۔ میرے لئے کچھ نہ مانگنا۔"

مولوی اُس وقت دونوں ہاتھ داڑھی پر دھرے بائیں طرف دیکھ رہا تھا۔ جب اُس نے دائیں طرف مُنہ پھیرا۔ اور دونوں ہاتھ داڑھی پر پھیرے۔ تو روف نے ہنس کر کہا۔ "کیا بات ہے۔ بس اب نواب بن ہی گئے سمجھو ——"

مولوی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ لیکن وُہ کچھ کہہ نہ سکا۔

روف نے پھر کہا۔" ساری عمر بوجھ ڈھوتے ڈھوتے گزر گئی۔ اب کس آس پر ماتھا رگڑ رہے ہو؟"

مولوی نے دیوار سے اُترتے ہوئے خشمگین لہجے میں کہا۔ "مَیں نے لاکھ بار کہا ہے۔ نماز کے وقت نہ ستایا کرو۔ یار بار کا مذاق اچھا نہیں۔ ایسا نہ ہو۔ کہیں ہنسی میں پھنسی ہو

جائے۔"

روف نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم خفا ہوتے ہو مولوی۔ مَیں مذاق نہیں کرتا۔ سچ کہتا ہُوں۔ ہم لوگوں کو خدا سے مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جو کچھ وُہ ہمیں دے سکتا تھا۔ اُس نے دے دیا۔ اب اِس سے بُرا کیا کرے گا۔ آخر اِنسانوں کے لئے گدھے بھی تو چاہئیں۔"

مولوی کی مذہب پرستی پر چوٹ لگی۔ اُسے لنگڑے روف سے یہ سُننے کی توقع نہ تھی۔ جو خدا کے فضل و کرم ہی سے توانا ہوکر روٹی کما رہا تھا۔ اُس نے آگ بگولا ہوکر کہا۔ "دُور ہو جا میری آنکھوں سے! جہنمی، لامذہب کتّے! اپنے نصیبوں کو نہیں روتا۔ خُدا پر کیچڑ اُچھال رہا ہے۔"

روف زور زور سے ہنسا۔ بولا۔ "ارے یہ کس وہم میں پھنس گئے ہو۔ کیا جہنم اور بہشت! جہنم تو یہی ہے۔ یہی چک پوسٹ کی منڈی۔ جہاں ہم سب کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ جوانیاں مٹی کے ذرّوں کے ساتھ مل کر آوارہ پھرتی ہیں۔ اور پھر شام کو ایک انڈا تک میسر نہیں آتا —— دُعا کرو ساری دُنیا پومپائی کے شہر کی طرح غرق ہو جائے۔"

مولوی اِس پر کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وُہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔

وِدیگ کے پاس پہنچ کر مولوی کے حلق میں اٹکے ہوئے جملے باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہو گئے۔ رُوڈا جیسے گِن رہا تھا۔ چاند سنگھ داڑھی کی لٹیں سنوار رہا تھا۔ اور جمال پتھر پر سر دھر کر لیٹا ہُوا تھا۔

مولوی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مذہب خدا کا نُور ہے رُوف! آج تم پر جوانی کا زور ہے۔ اِس لئے کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ لیکن کل —— جب یہ طوفان ختم جائے گا۔ تو تمہاری نظریں آسمانوں کو کریدنے لگیں گی۔ سمجھ گئے —— جاؤ کھاؤ اڑاؤ اور مزے کرو۔“

رُوڈا اور چاند سنگھ چونک پڑے۔ لیٹا ہُوا جمال اُٹھ بیٹھا اور بولا۔ ”کون کہتا ہے مذہب نُور نہیں ——“

مولوی نے ہنس کر کہا۔ ”یہ لنگڑا —— جیسے شاید آج یاڈہ آنے سے زیادہ پیسے ملے ہیں۔“

”توبہ۔ توبہ۔ واہگورو ——“ سب نے بے اختیار کہا۔ اور کریدتی ہوئی نظروں سے رُوف کو دیکھنے لگے۔

جمال نے پھر کہا۔ ”اِس کا دماغ پھر گیا ہے۔ کسی سے بخشش نہیں مانگتا۔ نواب زادے کی ہتک ہوتی ہے۔

مہینوں بھوکا رہنا پڑے۔ تو پڑا رہے گا۔ کسی سے روٹی نہیں مانگے گا۔ میں پوچھتا ہوں۔ ہم لوگوں کو شرم کاہے کی ہونی چاہیئے۔"

چاند سنگھ نے انگلیوں سے ڈاڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "سچ ہے۔ گورو نانک کی قسم! بالکل سچ ہے۔ آج ایک صاحب سے میں نے بخشش مانگی۔ تو گالیاں دینے لگا۔ لیکن میں بھی کہاں چھوڑنے والا تھا۔ جب تک ایک آنہ نہ لیا۔ پیچھا نہ چھوڑا۔ روف ہوتا تو جھگڑا کیا ہوتا۔"

روڈے نے کہا۔ "یار گالیوں کا کیا ہے۔ دن میں بیسیوں بار کھا ہی لیتے ہیں۔ ٹھیکیدار کی گالیاں۔ منشیوں کی گالیاں۔ وزیروں کی گالیاں۔ گالیاں تو سب دے سکتے ہیں۔ لیکن پیسے کوئی کوئی دیتا ہے۔ ہاہاہا ——"

روف شرمندہ ہو گیا۔ اسے اپنا فلسفہ پانی پر اٹھتے ہوئے بلبلے کی طرح بے حقیقت دکھائی دیا —— "سچ ہی تو ہے" اس نے سوچا۔ "جو ذلیل سے ذلیل کام کرتے ہیں شرفا سے وہ بخشش مانگنے سے کیوں شرمائیں —— اور پوچھیا تو اسی لئے غرق ہو گیا کہ ان لوگوں کو مانگنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔"

مولوی نے وردی کا کوٹ اتار کر سرہانہ بنایا۔ اور لیٹ

گیا۔ اُس نے روف کو ہرا دیا تھا۔ اور ساتھ ہی اُس کے مستقبل کے متعلق بھی خوفناک پیشین گوئی کی تھی۔ جب وہ خدا کا محتاج ہوگا۔ اب اُس کے تھکے ہوئے جسم اور مطمئن رُوح کو آرام کی ضرورت تھی۔

ایک دِن دوپہر کی جھلسانے والی گرمی میں کانٹے کے نزدیک فساد ہو گیا۔

چاندسنگھ ایک کھدرپوش سیّاح سے جھگڑا کر رہا تھا۔ سب قُلی اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ چاندسنگھ دو من کا صندوق ایک فرلانگ کی دُوری سے اُٹھا کر لایا تھا۔ اُس کا چہرہ، اُس کی ڈاڑھی اُس کی ٹانگیں سب پسینے سے شرابور ہو گئی تھیں۔ سر کے بال بکھر کر پریشان ہو گئے تھے۔ سیّاح اُسے صرف ایک آنہ دے رہا تھا۔ اور چاندسنگھ چار آنے مانگ رہا تھا۔ معمُولی تکرار کے بعد چاندسنگھ کے بالوں سے ڈھکے ہوئے چہرے پر چپت بھی پڑی تھی۔ اور اُس کے کانوں نے سیّاح کی گالیاں بھی سُنی تھیں۔ دراصل چاندسنگھ نے اپنے میلے ہاتھوں سے سیّاح کی اُجلی قمیص کا دامن تھام لیا تھا۔ اور اُسے چار آنے دیئے بغیر جانے نہ دیتا تھا۔ یہ بات سیّاح کو بہت ناگوار گزری۔ وُہ بمبئی کا ایک مشہور آدمی تھا۔ جس

کی نصف سے زیادہ عمر وطن کی خاطر جیل میں بیت گئی تھی۔ آج تک کسی نے اُس کی چپل کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ اور چیک پوسٹ پر ایک میلے، بندر نما اِنسان نے جس کے چہرے پر صرف دھنسی ہوئی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ اُس کا دامن تھام لیا تھا۔ اجلی قمیص پر اب تک میلی اُنگلیوں کے نشان تھے۔ جنہیں کھدر پوش سیّاح متاسف نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجمع میں چاند سنگھ کی اِس بدتمیزی پر بہت ناراضی پھیلی ہوئی تھی۔

"اُلّو کہیں کے —— عزّت والے آدمیوں کے بھی دامن تھام لیتے ہیں۔"

"آٹھ روپلے تنخواہ کے علاوہ رشوت کی بھی توقع رکھتے ہیں۔"

"شرم تو اِن لوگوں نے بھون کر کھا رکھی ہے۔"

"ایک آنہ کیا کم تھا۔ ایک اور چار میں اِنہیں فرق ہی دکھائی نہیں دیتا۔"

"ٹُون ایریا کا اِنتظام ہر جگہ ناقص ہے۔ ایسے آدمیوں کو اُن سے نکالا بھی نہیں جا سکتا۔"

سب تماشبین اپنے اپنے فقرے چُست کر رہے تھے۔ اور چاند سنگھ ندامت کے پسینے میں ڈوب کر اِکنّی کے کنگرے

دونوں روف کی طرف دیکھ کر ہنسے۔ اور چلے گئے۔

روف کو جیسے کسی نے گولی مار دی ہو۔ آج اُس کی خودداری کو شکست ہوئی تھی۔ آج اُس کی شگفتہ مزاجی خاک میں مل گئی تھی۔

وُہ سر جھکائے باؤلی کی طرف جانے لگا۔ شاید اُسے پیاس لگی تھی۔ یا پیاس سے زیادہ اُسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

وُہ میرے سامنے سے کئی قدم آگے نِکل گیا۔

"روف"

روف مڑکر میرے قریب آگیا۔

"دیکھا تم نے۔ چاند سنگھ کِتنا لالچی ہے۔" مَیں نے کہا۔

روف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سچ ہے منشی جی۔ ہم لوگ بہت لالچی ہیں۔ اور اِسی وجہ سے گالیاں بھی کھاتے ہیں۔"

پیچھے سے میرے معاون نے مجھے ایکسپریس چٹھی دکھائی۔ ہیڈ آفس والے بارہ سال کے سیاحوں کے ہندسے مانگ رہے تھے۔ اور آج ہی ——"

میرے سر پہ جیسے ڈھائی من سے زیادہ بوجھ چڑھ گیا۔

ہم دونوں نے ایک دُوسرے کی طرف استعجاب بھری نظروں سے دیکھا۔ جیسے اندر ہی اندر سے کہہ رہے ہوں۔ یہ نقشہ کیا آج تیار ہو سکتا ہے؟ گدھے بھی تو رات کو کسی درخت کے نیچے یا مٹی کے ڈھیر پر سوتے ہیں۔"

مَیں نے لمبی سانس کھینچ کر روف سے کہا "جاؤ روف۔ اِنتظار کرو۔ وُہ وقت آرہا ہے۔ جب تمہیں اور ہمیں اپنی محنتوں کا پُورا پُورا پھل ملے گا۔ جب ہماری جوانیوں کی قیمت ہمیں ملے گی۔ سردست جاؤ۔ کھاؤ انڈے اور لیٹو درنگ کے نیچے —— مَیں ہندسے تیار کروں گا —"

معاون نے پُوچھا۔ "اب؟"

"بنانے ہی پڑیں گے۔" مَیں نے نا اُمیدی کے لہجے میں جواب دیا۔

روف کے چہرے پر اطمینان کی جھلک سی نمودار ہوئی۔ وُہ میرے قریب آگیا۔ اور بولا۔ "پھر کیا ہوگا منشی جی!"

مَیں نے اپنے آپ کو کرسی پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "پھر کوئی تمہاری کمر پر ڈھائی من بوجھ نہ رکھ سکے گا۔ گالیاں نہ دے سکے گا۔ بے عزّت نہ کر سکے گا۔ سب ایک جیسے ہوں گے۔ ایک جیسے ——"

روف چلا گیا۔ اور ہم ہندسے بنانے میں محو ہوگئے۔

پچھلے سال کی میزان میں دو ہزار انگریز سیاحوں کا فرق آگیا۔ میرا ساون دیا کنڈ دھن ہے۔ اُس نے غلطی کی زیادہ پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا "کاش اسی طرح ——"

اس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ لیکن میں اُس کا مطلب صاف سمجھ گیا۔ اور اُسے احساس نہ دلانے کی کوشش کرتے ہوئے زیر لب مسکرا اُٹھا۔

دوسرے دن شام کو میں نے دریا کے کنارے روف کو لیٹے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور گھبراتے ہوئے پوچھا "منشی جی۔ وہ وقت کب آئے گا۔ جب سب ایک جیسے ہوں گے۔ وہ آج ہی کیوں نہیں آتا —— آج ہی ——"

میں نے ہنس کر پوچھا "تم انڈا کھا چکے۔ آج تو کھانا بہت اچھا تھا۔"

روف نے ریسٹوران کی طرف دیکھ کر کہا "اب میں انڈے نہیں کھاؤں گا۔ آج اُس خنزیر نے مجھے میز پوش سے مُنہ صاف کرنے پر خانساماں سے نکلوا دیا۔ حالانکہ مُفتیا فی انڈا پانچ پیسے دیتا تھا ——"

میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ بولا "بس اتنی سی بات پہ بگڑ گئے۔ ارے انڈے کھاؤ۔ انڈے۔ زیادہ سے زیادہ بوجھ اٹھا سکو گے۔"

روف نے مچلتے ہوئے کہا۔ "بس منشی جی اب نہیں کھاؤں گا۔ جب ہی کھاؤں گا۔ جب سب ایک جیسے ہوں گے۔ پھر نہ ریسٹوران سے کوئی نکلوائے گا۔ اور نہ کوئی فی انڈا پانچ پیسے مانگ سکے گا۔ لیکن منشی جی۔ وہ وقت آج ہی کیوں نہیں آجاتا ——"

مَیں نے کہا۔ "اپنے وقت پر سب کچھ ہوگا روف۔ سردست گالیاں سہو۔ چُپ رہو۔ اور اِنتظار کرو۔"

اُس دِن سے شاید روف نے انڈا نہیں کھایا۔ حالانکہ میرے سامنے کئی بار اُسے بارہ آنے سے زیادہ پیسے مِلے تھے۔ وُہ اب مولوی سے بھی شرارت نہ کرتا تھا۔ نہ نماز کے وقت اُسے چھیڑتا تھا۔ اور نہ چاند سنگھ کی ڈاڑھی کو کھینچتا تھا۔ گدھے کی طرح کمر پر بوجھ اُٹھائے ہوئے ہنہناتا بھی نہیں تھا۔ اور نہ بوجھ کے اَن دیکھے مالکوں کو گالیاں دیتا تھا۔ دراصل وُہ سب کچھ سہہ لیتا تھا۔ چُپ رہتا تھا۔ اور اِنتظار کرتا تھا۔ اُسے شاید نواب بننے کی توقع تھی —— اور کتنے ہی نواب لنگڑے بھی ہو گزرے ہیں۔

جاپان کی پیشقدمی سے برما اور رنگون کے متمول گھرانے ہندوستان کی طرف بھاگے۔ اور اُن میں سے کچھ لوگ کشمیر کی طرف آئے۔ پیسہ اُن کی حفاظت کرتا تھا۔ اور وہ پیسے کی حفاظت

کرتے تھے۔
چیک پوسٹ کی منڈی میں معمول سے زیادہ کام رہنے لگا۔ قلیوں کو بارہ بجے کی روٹی کھانی بھی مشکل ہو گئی۔ جان بچانے والے سیّاح قلیوں کو منہ مانگی بخشش دیتے تھے۔
ریسٹوران کے مالک نے بھی دیواروں پر قلعی کرادی تھی۔ اور میز کے میزوں اور کیبن کی بھی ہوئی کرسیوں پر کوٹنگ وارنش کرادیا تھا۔ میز پوش بھی دھلائے گئے تھے۔ اور ریسٹوران کے باہر جلی حروف میں ریٹ لسٹ چسپاں کی گئی تھی۔
روف کو اب مذاق کرنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ جب دیکھو کانٹے کے نزدیک ہاتھ سامان کا وزن کرا رہا ہے۔ یا سر پہ بوجھ لئے شاداں شاداں جا رہا ہے۔ سیّاحوں کا یہ ہجوم کتنے ہی دنوں جاری رہا۔ ہم دن بھر کام کرتے کرتے مرے جاتے تھے۔ اور دوسری طرف حکومت خوش تھی کہ سیّاح زیادہ تعداد میں کشمیر آرہے ہیں۔
ایک دن شام کو مجھے بھوک لگی۔ میں انڈا کھانے کی نیت سے ریسٹوران کی طرف گیا۔ دیکھا باہر برآمدے میں روف بیٹھا انڈے چھیل رہا ہے۔
"منشی جی۔ انڈے کھائیے۔ زیادہ کام کر سکیں گے۔"
اس نے مسکرا کر کہا۔

"روف ـ" مَیں نے کہا ـ "تم پھر اسی ریسٹوران میں انڈے کھا رہے ہو ـ جہاں ایک دن ــــ" روف نے کہا ـ
"ٹھیک ہے منشی جی ـ ٹھیک ہے ـ" لیکن اب اندر تو نہیں کھا رہا ہوں ـ اور آج کل کام زیادہ رہتا ہے منشی جی ـ اور خنزیر نے معافی بھی تو مانگی ہے ـ"
"معافی ــــ؟" مَیں نے تعجّب سے پُوچھا "تم سے معافی مانگی ــــ"

روف نے سنبھل کر کہا "نہیں ـ دراصل اُس دِن میرا ہی قصور تھا ـ مَیں نے چادر سے منہ صاف کیا تھا نا ــــ ہاں منشی جی ــــ یہ بھی تو معافی ہی ہوئی کہ مَیں پھر انڈے کھانے لگا ــــ"

تھوڑی دیر بعد روڈ اور چاند سنگھ بھی آ گئے ـ اُنہوں نے آئس کریم منگائی ـ اور وہیں برآمدے میں بیٹھ کر کھانے لگے ـ حالانکہ اِس سے قبل مَیں نے اُنہیں کبھی ریسٹوران سے کوئی چیز خریدتے یا کھاتے نہیں دیکھا تھا ـ

روف نے انڈے کی زردی مُنہ میں ڈالتے ہوئے کہا ـ "منشی جی ـ آج کل بڑے مزے کے دِن ہیں ـ خوب بخشیش ملتی ہیں ـ سُنا ہے یہ لوگ بڑے نیک دل ہیں ــــ اور تو اور اب مجھ سے سہا نہیں جاتا ـ خدا کرے ـ آپ کا وہ وقت کبھی نہ

آئے - جب سب ایک جیسے ہوں - اور کسی کو ایک انڈا بھی زیادہ کھانا نصیب نہ ہو۔"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا -

مَیں نے بے اختیار اپنے آپ کو کہتے سُنا - "روف"

روف نے دوسرا انڈا مُنہ میں ڈالتے ہوئے کہا "منشی جی یہ بڑے مزے کے دِن ہیں - گالیاں جمع نہیں ہوتیں - پیسے جمع ہوتے ہیں - اور آج —— آج مَیں نے چار روپے کما لئے ہیں - آپ بھی انڈے کھائیں منشی صاحب - بڑے مزے کے دِن ہیں -"

مَیں کھویا کھویا ہوا سا دریا کی طرف چل دیا - لہریں اُٹھ رہی تھیں - بڑھ رہی تھیں - اور رقص کرتے کرتے نابود ہو جاتی تھیں اور پانی بہے جاتا تھا - بہے جاتا تھا -

تین زاویئے

شالیمار باغ کی اُس بارہ دری پر جہاں کبھی حسن اور عشق، ناز اور نیاز اور گل و بلبل ملے ہوں گے۔ وہ تینوں ملے۔ ہونٹوں پر بے مطلب مسکراہٹیں پھیلائے ہوئے، آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے جذبات لئے ہوئے۔ اور اُن کے دائیں بائیں، آگے پیچھے مُغلیہ عظمت کا بے عنوان افسانہ کھُلا پڑا تھا۔ جسے لاکھوں نے پڑھا تھا، لاکھوں نے سُنا تھا اور لاکھوں پڑھنے اور سُننے کی آرزو رکھتے تھے۔ اور جس کا ہر شیدائی اپنے اپنے ظرف اور مذاق کے مطابق عنوان رکھتا آیا تھا —— شالہ مار، آماجگاہِ حُسن و عشق، قدرت کا شاہکار مُغلیہ فنِ تعمیر کی بہترین یادگار . . . .

چار بج چکے تھے اور نہ معلوم وہ تینوں کب باغ میں داخل

ہوئے تھے۔ اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق اُنہوں نے اِس افسانے کا کیا نام رکھا تھا کہ اُن میں سے ایک لمبے بالوں والے اِنسان نے اپنے سامنے کھڑے پست قامت نوجوان سے مُسکرا کر پُوچھا۔ ”آپ کا شبھ نام ؟“

”نام ؟“ پست قامت نوجوان نے آہستہ سے مُسکرا کر کہا۔ ”نام کبھی ہُوا کرتا تھا۔ اب کچھ بھی نہیں۔“

”کچھ بھی نہیں ؟“ لمبے بالوں والے اِنسان نے حیرت سے پُوچھا۔

”جی بالکل کچھ نہیں۔ ہاں آپ کو دِقّت ہو تو کچھ وقت کے لئے مجھے صحرائی کہہ کر پکاریں۔“

لمبے بالوں والے انسان نے ہنس کر کہا ”بڑا جذباتی نام ہے۔ صحرائی۔“

”اور آپ کا ؟“ اُسی انداز میں اُس نے دُوسرے نوجوان سے پوچھا جو فرش پر بکھرتے ہوئے، اُڑتے ہوئے پتوں کو اپنے پیروں سے مسلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرا ؟“ وُہ چونک کر متوجہ ہُوا اور بولا۔ ”مجھے منیم کہتے ہیں یعنی ڈولو مل رتن لال کا منیم۔ بہت بڑی دکان ہے ہماری۔“

صحرائی نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور پھر

لمبے بالوں والے اِنسان سے پُوچھا" اور آپ کا ؟"

لمبے بالوں والے انسان نے کیمرا اسٹینڈ کی پتلی پتلی آہنی ٹانگوں پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" اجی ناموں میں کیا رکھا ہے۔ آدمی دراصل عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ اور میرا عمل بس یہی لٹکتا ہُوا کیمرا ہے۔"

فہیم نے اُس کی پیٹھ پر لٹکتے ہوئے کیمرے کی طرف دیکھ کر کہا۔" بس یہی ٹھیک ہے، صرف عمل، یعنی عمل اچھا ہو تو ساری دُنیا بھلی لگتی ہے ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

صحرائی نے سگریٹ کا ایک کش کھینچتے ہوئے لمبے بالوں والے انسان سے کہا۔" تو گویا آپ فوٹوگرافر ہیں۔ لیکن نام بھی اگر بتا دیں تو کیا حرج ہے۔"

لمبے بالوں والے اِنسان نے بچّوں کی طرح ہنس کر کہا۔" جی حرج کوئی نہیں تھا۔ لیکن میرا نام اُسی دِن مر گیا جب ایک جوتشی نے میرے پاؤں میں چکر دیکھ کر میری بُوڑھی ماں سے کہا۔" مائی تیرا بیٹا ایک اُڑتا پنچھی ہے۔ اِسے قفس میں ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ یہ ساری دھرتی مجھے آشیانہ دکھائی دے رہی ہے۔"

صحرائی نے مسکرا کر پُوچھا۔" خوب۔ لیکن جنم کہاں ہوا تھا آپ کا ؟"

فوٹو گرافر نے کہا۔ "پپیلا ہیں۔ آپ کبھی اُس طرف گئے ہیں؟"

نسیم اچھل کر بول اُٹھا۔ "پپیلا۔ بہت اچھا ملک ہے صاحب! پچھلے سال ہم نے وہاں سے خشخاش منگائی تھی۔ اور اتنی سستی آئی تھی کہ ہمیں کافی فائدہ ہوا۔ ہمارے لالہ جی آپ سے مِل کر بے حد خوش ہوں گے۔ ممکن ہے ہم اِس سال بھی خشخاش کا سودا کریں اور آپ ہی کی وساطت سے ــ"

فوٹو گرافر نے بے چین ہو کر کہا۔ "آپ سودا ضرور کیجئے۔ لیکن میری وساطت سے نہیں۔ مَیں صرف تصویریں اُتارتا ہوں۔ اور دیس دیس گھومتا ہوں۔"

صحرائی یہ گفتگو بادلِ نخواستہ سُن رہا تھا۔ فوٹو گرافر نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔ "اور آپ نے ہمیں اپنے شغل کی نسبت کچھ نہیں کہا۔"

صحرائی کا سگریٹ جلتے جلتے اُنگلیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اُس نے آخری کش لگا کر سگریٹ کو پھینکا اور کہا۔ "شغل تو ویسے کچھ بھی نہیں۔ ہاں کبھی کبھار ذہن میں جمع ہوئے تاثرات سے ایک لہر سی اُٹھتی ہے جو یا تو گیت بن جاتی ہے یا ایک کہانی۔ ورنہ ویسے کوئی خاص شغل نہیں۔ اور سچ پوچھئے یہی

لہر مجھے دو سو میل سے یہاں کھینچ لائی۔ یہاں جہاں کبھی شاہجہاں اور ممتاز محل انہی بارہ دریوں پر بیٹھ کر ایک دوسرے میں کھو جاتے تھے۔ ڈوب جاتے تھے پھر اُبھرتے تھے۔"

مُنیم نے پھٹی پھٹی نظروں سے باغ کا جائزہ لیا۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ شاہجہاں اور ممتاز محل کہاں ڈوبا کرتے تھے کہاں اُبھرا کرتے تھے۔"

اور فوٹو گرافر نے ہنس کر کہا۔ "تو آپ کوی ہیں۔ شاعر جو فوٹو گرافر کے بہت قریب ہوتا ہے۔ یعنی ایک تخیل سے تصویریں کھینچتا ہے۔ اور دوسرا کیمرے سے۔"

صحرائی نے پُختہ کار کی طرح اپنے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیلا دی اور کہا۔ "یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے ورنہ محکوم ملک میں کوئی شخص اپنے آپ کو شاعر کہہ سکتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہو بھی ——؟"

فوٹو گرافر نے اندازِ گفتگو بدلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "سچ ہے صحرائی صاحب! انگریز صرف ہمارے ملک ہی پر حکومت نہیں کرتا۔ ہماری روحوں پر بھی قابض ہو گیا ہے۔ اور یہ قبضہ اِتنا شدید ہو چلا ہے کہ ہمارے لاشعور میں شکست پسندی کے گہرے نقوش پیدا ہو گئے ہیں۔ ہم سچ مچ شاعر نہیں ہو سکتے۔ ہاں مصوّر ہو سکتے ہیں۔"

مُنیم نے بے ضرورت ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔ "یہ مصوّری

بھی ایک طرح کا جنون ہے۔ ہمارے لالہ جی کہا کرتے ہیں۔ جب وُہ جوان تھے تو اُنہیں بھی کیمرے کا بے حد شوق تھا۔ جو پیسہ اُنہیں مِلا کرتا وُہ اِسی جنون کی نذر کرتے۔ حتیٰ کہ ایک دِن اُنہیں بمبئی سے انعام مِلا۔ خاصا انعام سوا سَو روپے کا۔ بلکہ ہماری آج کی دُکان اُسی انعام کا نتیجہ ہے۔"

فوٹوگرافر اور صحرائی کے منہ حیرت سے کُھل گئے۔ منیم نے دوبارہ فخریہ انداز میں کہا۔ "اُدھر سے انعام مِلا۔ اِدھر سے صابُون کی دُکان چل نکلی۔ اُس میں نفع ہوا تو نمک آیا۔ پھر روئی پھر ہلدی اور پھر کریانہ اور آج ——— کریانے کے عِلاوہ تھوڑا بہت سُود بیاج بھی ہوتا رہتا ہے۔ میوے کی آڑھت بھی کرتے ہیں اور چاندی کی خرید و فروخت بھی ———"

فوٹوگرافر نے آنکھیں پھیلا کر پُوچھا۔ "بڑے خوش قسمت ہیں آپ کے لالہ جی، شوق نے اُنہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا لیکن اب بھی وُہ شوق ہے کہ نہیں ——— ؟"

منیم نے کہا۔ "جی نہیں، کہتے ہیں وُہ جوانی کے دِن تھے۔ جب بُرے بھلے کی سدھ بدھ نہیں ہوتی۔ اب اُنہیں کیمرے سے نفرت ہے اور کیمرے کی تصویروں کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ہاں جرمن پرنٹ کی مہا لکھشمی کی تصویر ملے تو دکان میں لٹکا دیتے ہیں ——— بڑے اصُولی آدمی ہیں۔"

صحرائی نے نہ جانے کیوں ایک خشک پتے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مسلتے ہوئے ہنسا اور پھر فوٹوگرافر سے پوچھا۔ "آپ یہاں کب آئے؟"

"۲۵ اکتوبر کو۔ اِرادہ یہی ہے کہ کچھ تصویریں اُتار کر لے جاؤں۔ لیکن دِقّت یہ ہے کہ فِلم نہیں مِلتے۔"

"کتنے فوٹو لے چکے آپ؟"

"اٹھارہ ایک۔ اب کیمرے میں صرف چھ باقی ہیں۔ وہ بھی کل تک ختم ہو جائیں گے۔"

"کِس قسم کے فوٹو لیتے ہیں آپ، یہی مناظر کے، درختوں کے، عمارتوں کے؟"

"جی نہیں،" فوٹوگرافر نے ہنس کر کہا۔ "میرا مذاق کچھ نرالا ہے۔ مَیں صرف اُن کی تصویریں لیتا ہوں۔ جن کی جڑیں دھرتی کی چھاتی میں گڑ گئی ہیں لیکن دو جیں ابھی وسعتوں ہی پر ہیں ——"

صحرائی سے اب کھڑا نہ رہا گیا۔ اور تینوں زمین پر بیٹھ گئے۔

"اِس سے آپ کا مطلب؟" صحرائی نے پوچھا۔

فوٹوگرافر نے چمڑے کے بیگ سے کچھ تصویریں نکالیں اور اُنہیں فرش پر بکھیرتے ہوئے بولا۔ "دیکھ لیجئے۔ شاید میرا مطلب

واضح ہو جائے گا۔"

صحرائی تصویریں دیکھتا گیا۔ اور پھر وہی تصویریں منیم کے ہاتھ میں پہنچتی گئیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی تصویریں جن کے میلے بدن تصویروں میں بھی عریاں تھے۔ معمر عورتیں جن کے چہروں کی جھریوں میں زمانے نے اپنے لازوال قلم سے عجیب عجیب دور کھودے ہوئے تھے۔ گھاس پھوس کی جھونپڑیاں جن کے آگے مریل سے بیل دُور دُور کی ہریالی کو تک رہے تھے۔ نوجوان بھکارن جو ایک بڑے مجمع میں پیٹ کے لئے اپنے افلاس کا رقص کر رہی تھی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں شہوانیت کے سانپ لہرا رہے تھے۔ پگ ڈنڈیوں پر بیٹھے ہوئے فقیر جو گلمرگ جانے والے ہر سیاح کے آگے اپنا نحیف ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ اور جرائم پیشہ قبیلہ کی وہ عورتیں اور خیمے جنہیں دیکھتے ہی انسان کے بدن میں تھرتھری سی پیدا ہوتی ہے اور اُن کی نیت مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔ آخری تصویر صحرائی کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ ایسی نظروں سے فوٹوگرافر کو دیکھنے لگا جو آپ ہی آپ کہہ رہی ہوں کہ شاعر تو تُو ہے۔ جو دُنیا کی کھڑکی کھول کر کیمرے کی آنکھ سے اندر جھانکتا ہے۔ اور ایسے ایسے بھید اور زخم پالتا ہے جو ہزاروں برس ٹکریں مارنے کے بعد بھی ایک مفروضہ شاعر نہیں پا سکتا۔ جس کی رُوح پر

نہ انگریز کا قبضہ ہے نہ شکست پسندی کا باریک اور مضبوط خول۔

فوٹوگرافر نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "پسند آئیں آپ کو؟ میں ہمیشہ سے حقیقی آرٹ کا متلاشی رہا ہوں۔ کیونکہ جن لوگوں کے پاس یہ تصویریں جائیں گی اُنہیں نہ کشمیر کی حکومت سے کوئی غرض ہے نہ کشمیریوں کے افلاس سے ہمدردی، وہ صرف قدرت کی اصلی پینٹنگ (Painting) دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب دیکھئے یہ بوڑھی عورت ہے۔ اِس کی یہ جھُریاں کتنی شاندار ہیں۔ اِن سے آدمی یعنی نفسیات کا طالب علم ایک مستقل سٹڈی (Study) کا کام لے سکتا ہے۔ اور یہی میرے خیال میں حقیقی آرٹ ہے۔ حُسن اور حقیقت کی ہم آہنگی۔

صحرائی نے مرعوب ہو کر آہستہ سے کہا۔ " بالکل بجا ہے۔ میں سوچتا ہوں اِس تصویر کو دیکھ کر ایک لمبی نظم کہی جا سکتی ہے ___ عورت، جو نورجہاں بھی تھی۔ ممتاز محل بھی اور یہ بڑھیا بھی ___ جس نے شراب بھی پلائی، اپنے مدفن پر تاج محل بھی تعمیر کرایا اور پہپلا کے ایک فوٹوگرافر کے آگے کھڑی ہو کر اپنی جھُریوں کی تصویر بھی کھچوائی "!

منیم نے ہنس کر کہا۔ " لیکن صاحب یہ صورتیں اِتنی بدحال نہیں جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں جب یہاں فسادات

ہوئے ۔ تو عورتیں تک اپنے گھروں سے ڈانگ لے کر نکلیں۔ خدا غارت کرے اِس قوم کو ۔۔۔!"

فوٹوگرافر نے چونک کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اُن دنوں کولمبو میں تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے کشمیر کے فسادات کے متعلق ایک بار اخبار میں کچھ پڑھا ضرور تھا۔ لیکن اب اچھی طرح یاد نہیں ۔۔۔۔ کچھ لوگ مارے بھی گئے ہوں گے؟"

"کچھ لوگ ہی کیوں؟ سینکڑوں، اور دکانیں بھی لوٹ لی گئیں لیکن شکر ہے۔ ہم بچ گئے۔ ہمارے لالہ جی کی دوسری دھرم پتنی مر گئی تھی۔ اور دکان بند تھی۔ ورنہ ہمارا بیڑا بھی پار ہوا ہوتا۔"

فوٹوگرافر نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ بلوائی ہجوم میں آئے ہوں گے۔"

"بہت بڑا ہجوم صاحب! جس کی ہزاروں آنکھوں میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ ہزاروں ہاتھوں میں ڈانگ اور پتھر تھے۔"

فوٹوگرافر نے ہنس کر کہا۔ "کتنی اچھی پکچر ہوتی۔ ہجوم۔ جو اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہو۔"

"لیکن فساد کیوں ہوئے منیم صاحب؟" صحرائی نے پوچھا۔

"یہی بھوک کی وجہ سے ہا!"

"جی نہیں - بھوک بہانہ تھا۔ مقصد در اصل لُوٹ مار
تھا۔" منیم نے جواب دیا۔

صحرائی کا چہرہ جیسے پچک گیا۔ اُس کا بدن بے مایہ کپڑے
کی طرح ڈھیلا ہو گیا۔ اسی وقت ایک خوانچہ فروش آ گیا۔
چھابڑی کو زمین پر رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ "سلام
سائیں جی، سیب، گوشہ بگو، تریل کھائے گا؟"

فوٹوگرافر نے پوچھا۔ "کس بھاؤ دو گے؟"

خوانچہ فروش نے ایک سیب ہاتھ میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔
"آپ سے کمانا کیا، خدا دوست ہو۔ سیب بارہ آنے سیر ملیگا،
گوشہ بگو دس آنے اور تریل ساڑھے آٹھ آنے۔ بہت اچھا پھل
ہے اور اِسی باغ کا ___"

"اِسی باغ کا؟" منیم نے پوچھا۔

"خدا کی قسم!"

"بہت مہنگے بیچتے ہو۔ یہ نہ سمجھو ہمیں پھلوں کا کچھ پتہ
نہیں - ہم بھی آڑھت کا کام کرتے ہیں۔" منیم نے
دوبارہ کہا۔

"تو جو مرضی آئے ___ دے دو۔" چھابڑی فروش
نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

منیم نے ایک سیب کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔

"چھ آنے سیر دیں گے۔ کہو منظور!"

چھابڑی فروش لاجواب سا ہو گیا۔ بولا "بچے کی قسم! سات آنے میں خود خریدا ہے۔ آگے حاکم ہو ——"

"چل تول تین سیر" منیم نے سیب کھاتے ہوئے کہا۔ "تکڑی میں پاسنگ تو نہیں ؟"

چھابڑی فروش نے کہا۔ "اتنی بے ایمانی نہیں کرتا ہوں اور کروں بھی کیوں جب دام کھرے ملیں۔"

منیم نے اپنی جیب سے چھ آنے نکال کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور ڈھیر سے دوسرا سیب اُٹھا کر کھانے لگا۔

چھابڑی فروش نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کم ہیں لالہ۔ لفظ سات آنے کا ہو گیا۔"

منیم حیران رہ گیا۔ بولا۔ "تو پھر اُٹھا لو سارے سیب، ہم اتنے مہنگے سیب نہیں کھا سکتے۔"

چھابڑی فروش نے خندہ پیشانی سے سیب واپس اُٹھائے اور چل دیا۔

منیم نے اپنے سہمے ہوئے سے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بڑا چالاک بنا پھرتا تھا۔ لیکن ہم نے بھی دو کھا ہی لئے ..."

فوٹوگرافر اور صحرائی آہستہ سے مسکرا دئیے۔

دن ڈھلتا گیا۔ اور میٹھی میٹھی سردی نومبر کی شرمائی ہوئی دھوپ کی گود میں سے سر نکالنے لگی۔ فوٹوگرافر نے فرش پر بکھری ہوئی تصویریں بیگ میں ڈالتے ہوئے صحرائی سے کہا۔ "آپ اب کیا سوچ رہے ہیں صحرائی صاحب! اپنا کوئی گیت ہمیں بھی تو سنائیے۔"

صحرائی نے کہا۔ "سوچ رہا ہوں، آیا ہم فطرت کی حقیقی نقاشی کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، انہی رنگوں میں اسی خدوخال کے ساتھ، وہی رعنائی اور جاذبیت لئے ہوئے۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی کامیاب نہیں رہ سکتا۔"

فوٹوگرافر نے کہا۔ "آپ کسی حد تک سچ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک مصور فطرت کے کسی رنگین حصے کی تصویر اپنے کیمرے کی مدد سے دنیا کو دکھا سکتا ہے۔ جو شاید شاعر نہیں کر سکتا۔"

صحرائی نے چمک کر کہا۔ "یہ غلط ہے صاحب! مصوری اور شاعری ادب کی قسمیں ہیں۔ اور ادب کسی ایک انسان پر ختم نہیں ہو سکتا۔ جب تک زندگی ہے۔ ادب موجود ہے۔ اور جس جس پہلو زندگی کروٹیں بدلتی رہے گی ادب بھی بدلتا رہیگا۔ مثلاً اسی باغ کو لیجئے۔ کون جانے یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔ اِن

ڈولگراف اور صحرائی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔
اور پھر تینوں وہاں سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگے۔
اُن کے پاؤں کے نیچے زرد اور لال پتے چرچر چرچر کرتے
رہے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ "ہمیں نہ روندو۔ ہمیں بہار
میں دوبارہ آنا ہے۔"
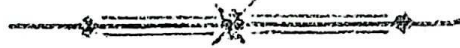
Abu-Summaya
Research Scholar

فرار

یہ ہسپتال نہیں، پناہ گاہ ہے۔ اُن بدقسمت اِنسانوں کی جو زندگی سے یا تو خود بھاگ کر آتے ہیں یا جنہیں زندگی بھاگنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہاں ایسے بھی پناہ گزین ہیں جو مرنے سے پہلے جدوجہد کرنے کی تھوڑی بہت اِستطاعت رکھتے ہیں۔ یہ اِستطاعت شاذونادر ہی کامیاب ہوتی ہے۔ ورنہ عام طور پر موت اِسے بھی رُوح کے ساتھ تحفے کے طور پر قبول کر لیتی ہے اور مرنے والے کی ہمّت پر ایک قہقہہ لگاتی ہے۔

ہسپتال کے وارڈوں میں صبح سے شام تک ایک معنی خیز خاموشی سی طاری رہتی ہے۔ اور ایک عجیب نا اُمیدی سی۔ جسے سمجھنا ناممکن نہیں۔ البتہ محسوس کرنا مشکل ہے۔ مریض کبھی کھڑکیاں کھول کر بیٹھتے ہیں اور کبھی برآمدے میں، اُن کی نگاہیں

دُور دُور بھٹکتی رہتی ہیں۔ اَور اُس دُنیا کو دیکھتی رہتی ہیں۔ جو ہسپتال سے کچھ دُور، میدان سے پرے، شور و شر، گہما گہمی اَور بھیڑ بھاڑ سے پٹی پڑی ہے۔ جہاں زندگی سمندری طوفان کی طرح ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ اَور موت قہقہوں کی اوٹ میں جھانکتی رہتی ہے . . . . . .

ہسپتال میں مریضوں کے علاوہ اَور بھی کچھ لوگ ہیں۔ جو بظاہر مفرور نہیں لیکن جنہیں زندگی سے، باہر کی دُنیا سے اَور اِس سارے ہنگامہ سے تنفر سا ہے۔ مثلاً بختہ کار کمپونڈر جو دواخانہ کی کھڑکی پہ عینک لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اخباروں کے وُہ چیتھڑے پڑھتا ہے جن میں مریضوں کے رشتہ دار ڈبل روٹیاں لپیٹ کر لاتے ہیں۔ جب گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ اَور چناروں کے پتے شرما شرما کر سرنگوں ہوتے ہیں۔ وُہ کِسی وارڈ میں داخل ہوتا ہے۔ اَور جو چیز جہاں سے ملے قبول کر لیتا ہے۔ تمباکو کے ایک دو کش چائے کی ایک آدھ پیالی، بچا کھچا سالن یا روٹیوں پر لپیٹے ہوئے اخباروں کے چیتھڑے، اُس کے چہرے پہ ہر وقت ہنسی کا طوفان ہوتا ہے جو گھٹنے ہی میں نہیں آتا۔ اور خصوصاً اُس وقت زیادہ تیز ہوتا ہے۔ جب کوئی مفرور اِس پناہ گاہ کی درودیوار سے بھی نجات پاتا ہے۔ سُنا ہے کبھی چار بچوں کا باپ ہوا

کرتا تھا۔ جو سب کے سب وبائی بیماری کا شکار ہو گئے۔ آخری بچے کی موت پر جن لوگوں نے اُسے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں اِس کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہیں ٹپکی۔ اُلٹا قہقہے پہ قہقہہ لگاتا رہا۔ اور تب سے آج تک برابر قہقہے لگا رہا ہے۔ اِس کے رشتہ دار، دوست احباب اِن قہقہوں کو سخت جانی اور بے شرمی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن کمپونڈر کو اُن کی پروا نہیں۔ وُہ صُبح سے شام تک قہقہے لگاتا جاتا ہے۔

اُس کے علاوہ ایک نرس ہے، بے حد خوبصورت اور جوان۔ اُس کے چہرے پر عجیب متانت اور سنجیدگی ہے۔ وُہ بولتی کم ہے سُنتی اور دیکھتی زیادہ ہے۔ جب وُہ سفید لباس پہن کر وارڈ میں داخل ہوتی ہے۔ تو یہی گمان گزرتا ہے۔ کہ سنسکرت کے کسی عالم کی تخلیقی شہزادی بد دعا کے زیرِ اثر اُن رشیوں کی خدمت کر رہی ہے جو زندگی سے گھبرا کر، زندگی کے مایا جال سے بچ کر جنگلوں میں عبادتِ الٰہی میں مصروف ہیں۔ اور زندگی جنگلوں سے باہر اُن کا منہ چڑھا رہی ہے۔ اُن پر قہقہے لگا رہی ہے اور بعض اوقات اُنہیں حُسن و عشق کے دلفریب کھلونے دِکھا کر واپس آنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ لیکن وُہ رشی ہی کیا، جو زندگی کے اِس

دام میں پھنس جائیں اور قدرت کو تقدیر انسان کے ہاتھوں مغلوب ہوتے دیکھ سکیں۔

سر لیفوں کو جس قدر محبت ہیرو ڈکمپونڈر سے ہے۔ اُسی قدر نفرت اس خوبصورت اور سنجیدہ نرس سے ہے۔ ایک طرف وُہ داخل ہوتی ہے اور دوسری طرف دیکھنے والے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی وُہ اپنی آنکھوں سے یہ باتیں سُنتی ہے۔ لیکن ہمیشہ چُپ رہتی ہے۔ اُس کی خاموشی نے ہر وقت مجھے تذبذب میں ڈال رکھا ہے۔ جوانی اور حسن، کبھی خاموش رہ سکتے ہیں؟ کبھی سنجیدہ بن سکتے ہیں؟

کہتے ہیں یہ ایک ہندو لڑکی تھی۔ جو بچپن ہی میں بیوہ ہو گئی اور جوانی میں اپنے خاندان کا نام ڈبو کر، اپنی ساتھ پنڈتوں کو ٹھوکر میں چلا کر ایک مسلم نوجوان کے ساتھ بھاگ نکلی۔ اُس کے رشتہ دار تڑپ اُٹھے۔ دھرم کانپ اُٹھا۔ ہندو عورت کا آدرش سرنگوں ہو گیا۔ گاؤں میں ہاہاکار مچ گئی۔ دھرم منتر جپنے اور دھرم کے ٹھیکیداروں نے سوچ بچار کیا۔ بیوہ لڑکی کی عشق پیشہ کی بے حیائی پر اور کھلی بغاوت پر بہت حرف بیچ گئے۔ لیکن وہ بھاگ چکی تھی۔ اُس کے شباب کی ٹھیکیداریوں کو سہارا مل گیا تھا۔ اور جیسے سہارا ملے وُہ مذہب کی کیا پروا کرتا ہے۔ کہتے ہیں اسی فرار نے نرس کو سنجیدہ بنا دیا ہے۔

اور اُس کے حُسن و شباب میں متانت کا گہرا رنگ بھر دیا ہے۔ اب بھی کچھ نیک بندے اُس کے مُنہ پر بُرا بھلا کہتے ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی خاموش رہتی ہے۔ بولتی کم ہے، سُنتی اور دیکھتی زیادہ ہے۔

نرس کے بعد ڈاکٹر ہیں ایک بڑا ڈاکٹر دوسرا چھوٹا ڈاکٹر۔ بڑا ڈاکٹر صرف جمعرات کو آتا ہے۔ اور وارڈوں کا گشت لگا کر چلا جاتا ہے۔ اُسے یہ سُننے کی فرصت ہی نہیں کہ ان آٹھ دنوں میں کتنے مفرور پناہ گاہ میں چھپ گئے۔ اور کتنے زمین میں۔ وہ پُرشور دُنیا سے بھاگا بھاگا آتا ہے۔ اور بھاگا بھاگا واپس جاتا ہے۔ اُن کی اس بھاگا بھاگی پر کسی کو اعتراض نہیں۔ نہ مریضوں کو، نہ محافظوں کو۔ البتہ ان کے آنے سے پہلے جوش و خروش کی ایک لہر سی اُٹھتی ہے۔ جو اُن کے جانے کے بعد اپنی موت آپ مرتی ہے۔ اور سارے ماحول پر ایک معنی خیز خاموشی سی، عجیب ناامیدی سی چھا جاتی ہے۔ جسے سمجھنا ناممکن نہیں البتہ محسوس کرنا مشکل ہے۔ مجھے ایسے آدمیوں پر رشک آتا ہے جو زندگی کی پیٹھ پر چڑھ کر سواری کرتے ہیں۔ اور دُنیا تکتی رہتی ہے۔

چھوٹے ڈاکٹر صاحب رات دن ہسپتال ہی میں رہتے ہیں۔ اوٹ ڈور بیماروں کو دیکھنے کے بعد وہ چنار کے نیچے

یا تو کوئی کتاب لے کر بیٹھتا ہے یا کچھ کھانے لگتا ہے۔ انڈے، فروٹ، مٹھائی . اُس کے خیال میں بیماری کوئی چیز ہی نہیں۔ محض ایک توہم غذا کے فقدان کا پیدا کردہ ... البتہ غذا ـــــ وہ غذا جو انسان کو نہیں ملتی۔ بیماروں کو نہیں ملتی۔ کسی کو نہیں ملتی۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے ازل سے آج تک سب آوارہ ہیں۔ انسان شہروں اور بستیوں میں، حیوان جنگلوں اور ویرانوں میں۔ انسان کی سیاست، ترقی، تہذیب ادب، سب اسی غذا کے پیچھے آوارہ ہیں۔ حتیٰ کہ کمپونڈر کے قہقہے اور نرس کی سنجیدگی بھی اسی غذا کے مختلف رُوپ ہیں۔ اسی آوارگی کی متضاد شکلیں۔ ایک آگ ہے کہ اُس کے دماغ میں دہک رہی ہے، ایک ناسُور ہے جو اُس کے خیالات سے رس رہا ہے۔ اور وہ خوش ہے کہ اُس نے بالآخر زندگی کا بھید پالیا ہے۔ اور وہ بھی پناہ گاہ میں جو ہسپتال نہیں۔

ایک دن ملول سا سماں تھا۔ بادل کے کچھ ٹکڑے پہاڑوں میں پناہ لینے کے لئے آسمان پر بھاگے جا رہے تھے۔ اور کچھ ٹکڑے بغاوت پر اُتر کر وادی کی طرف لپک رہے تھے چھوٹا ڈاکٹر چنار کے نیچے ایک عورت کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے دانت میلے تھے۔ آنکھیں میلی تھیں۔ کپڑے میلے تھے۔

ساری زندگی میلی تھی۔ اور اُس کے دائیں طرف ایک خوش پوش نوجوان اپنی بیوی سے باتیں کر رہا تھا۔ اُن سے ذرا دُور فرش پر بیمار عورت کا ساتھی مرد ڈاکٹر کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اشارے سے اُسے بُلایا اور پُوچھا۔ "یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"میری گھر والی ہے۔" مرد نے ہنس کر کہا۔

"گھر والی؟ لیکن یہ اتنی میلی کیوں ہے؟"

مرد سر جھکا کر زیرِ لب ہنسا اور کہا۔ "بس ابھی ہی ہے ڈاکٹر صاحب ہمارے گھروں میں ایسی ہی عورتیں ہوتی ہیں۔"

خوش پوش نوجوان کے ساتھ باتیں کرنے والی عورت کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور ڈاکٹر نے میلی عورت کے شوہر سے کہا "خیر۔ اسے کوئی بیماری نہیں۔ خدا نے اسے بچہ دیا ہے۔"

"بچہ؟" شوہر کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ "بچہ؟ مجھے بچہ نہیں چاہئے۔ میرا گھر پہلے ہی بچوں سے بھرا پڑا ہے مجھے بچہ نہیں چاہئے۔

ڈاکٹر نے اُس کی اندرونی آواز نہیں سُنی۔ بولا۔ "اسے غذا دو، ڈبل روٹی۔ انڈے، مکھن، شوربہ اور

فروٹ ـــــ"

عورت نے پھٹی پھٹی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔
جن میں خوشی اور استعجاب کے جذبات کم تھے۔ مگر پیچھے رہنے کے تاثرات زیادہ۔

مرد جلدی فوراً بول گیا۔ بولا۔ "لیکن انڈے ڈیڑھ روپیہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

ڈاکٹر اُس کا مطلب تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا "جسے خدا بچہ جیسی نعمت بخشے وہ گرانی کی پروا نہیں کرتا ـــــ جاؤ اسے غذا دو۔ صبح اور شام، رات اور دن ـــــ صرف غذا ـــــ!" لیکن اُس کی روح اندر سے برابر کہتی رہی "مجھے بچہ نہیں چاہیئے۔ دُنیا گرانی کی آگ میں جل رہی ہے مجھے بچہ نہیں چاہیئے ـــــ"

ڈاکٹر خوش پوش نوجوان کی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ اُسے ملاحظہ کئے بغیر ہی اُس نے کہا "معلوم ہوتا ہے۔ یہ غذا بہت کم کھاتی ہیں۔ یا کھاتی ہی نہیں۔"

میاں بیوی دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بات سچی تھی اسی لئے۔

اُس کے شوہر نے ڈاکٹر کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "بالکل بجا ہے ڈاکٹر صاحب میں اسے سمجھاتے

سمجھاتے تھک گیا۔ کِسی طرح مانتی ہی نہیں۔"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ بُری بات ہے۔ غذا زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔"

عورت نے نخرے کرتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔ "مجھے دراصل یہ چیزیں پسند ہی نہیں۔ یہ بھی کیا زندگی ہے کہ آدمی صبح اَور شام رات اَور دِن صرف انڈے چھیل چھیل کر کھایا کرے۔ پھونک پھونک کر دُودھ پیا کرے اَور زندہ رہے۔"

اُس کا شوہر اَور ڈاکٹر دونوں ہنس پڑے۔ پھر ڈاکٹر نے کہا۔ "اِس وقت آپ کی پسند کا سوال نہیں محترمہ۔ اِس وقت زندگی کا سوال ہے۔ اَور زندگی —— بڑی قیمتی ہوتی ہے ——"

عورت کے شوہر نے خرچ دیتے ہوئے کہا۔ "اب اِس کی کوئی ضد نہ چلے گی ڈاکٹر صاحب! آپ اِطمینان رکھئے۔ یہ ہر چیز میری نظر بچا کر گلی میں پھینکتی رہی ہے۔ جب سے گلی کا کتا ہاتھی برابر ہو گیا ہے۔ لیکن اب —— اب اِسے خود ہتھنی بننا پڑے گا —— ہی ہی ہی ——"

دونوں ٹانگے پہ بیٹھ کر چلے گئے۔ گھنگھروں کی آواز میں ہنستے ہنستے، ایک دُوسرے کو مخول کرتے کرتے ——

"اب گلی کا کتّا ہاتھی نہیں بنے گا۔ اور زندگی بڑی قیمتی ہوتی ہے —"

دُوسرا جوڑا ابھی تک سبزے پر بیٹھا حیران نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اُٹھتے ہوئے مرد سے پوچھا۔ "تم جاتے کیوں نہیں۔ کچھ اور کہنا ہے؟"

مرد نے کھڑے ہو کر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ نے انڈے، روٹیاں اور شوربہ کہا نا —"

"ہاں ہاں انڈے۔ شوربہ، روٹی اور فروٹ — خوب کھلاؤ۔ خوب کھلاؤ۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ اور وہ دونوں وہیں کھڑے رہے۔ ہارے ہوئے جواریوں کی طرح۔ گناہ کرتے کرتے پکڑے ہوئے مجرموں کی طرح۔

تھوڑی دیر بعد شوہر نے کہا۔ "چلو۔ اب دیکھتی کیا ہو۔ جو ہونا تھا ہو گیا — لیکن تم نے مجھے کیوں نہیں کہا۔ اصل میں یہ بات . . . ہے۔"

بیوی نے لجاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا . . . اپنی طرف سے . . . . ."

مرد نے تُنک کر کہا۔ "مجھے بچّے کی پروا نہیں۔ بچہ جائے جہنّم میں۔ لیکن انڈے — روٹیاں — اور

شوہر ـــــــ"

"مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ اللہ قسم۔ مجھے کوئی بیماری نہیں۔" بیوی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

دونوں پھاٹک کی طرف جانے لگے۔ اور پھاٹک کے نزدیک رکے۔ عورت ہسپتال کی طرف دیکھنے لگی۔ اُداس اُداس نظروں سے بھری ہوئی آنکھوں سے جن میں ایک گرید تھی ایک فریاد تھی زندگی کے خلاف، اور اُسے محسوس ہوا کہ زندگی سے فرار ہونے کا جذبہ اُس کے دماغ میں رینگ رینگ کر داخل ہو رہا ہے۔ اور مایوس پناہ گاہ اپنی ٹھنڈی اور سپید باہیں کھول کر اُسے اپنی آغوش میں لینا چاہتی ہے۔

آسمان پر بادل کے کچھ ٹکڑے پہاڑوں میں پناہ لینے کے لئے آسمان پر چھائے جا رہے تھے۔ اور کچھ ٹکڑے بغاوت پر اُتر کر وادی کی طرف لپک رہے تھے ـــــ ایک عورت کا شوہر اپنی بیوی کو مٹی بنانے کے لئے زندگی کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اور دوسری عورت کا شوہر اپنی بیوی کو روح کی آواز میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ "تم کتنی پیاری ہو۔ گُڈیا" اور بیوی ـــــ زندگی سے بھاگنے کی تیاریاں کر رہی تھی

اور اُن سے پہلے —— ہسپتال کے برآمدے
پر خوب صورت نرس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے
اور جلد جلد ایک وارڈ میں سنجیدہ صورت بنا کے
داخل ہو گئی۔ تما شا جائے کیلئے؟